Veer Kunwar Singh University, Ara
Study Materials
B.A (Subs.) Urdu Part 1

Prof.(Dr.) Aftab Ahmad
Deptt. of Urdu,
Maharaja College,
Ara (Bhojpuri)

واردات

منشی پریم چند

سوال ۱ : افسانہ نگاری کے فن سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

یا مختصر افسانوں کی خصوصیات بیان کیجئے۔

یا مختصر افسانے نے آج کے افسانوں کو مجبوریوں اور پابندیوں سے وہی چیز دی ہے، جس کی اسے ضرورت تھی۔

جواب : سید صفی مرتضیٰ نے اپنی کتاب ''اصناف ادب کا ارتقاء'' میں مختصر افسانے کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

''قصہ کی ایک شکل مختصر افسانہ ہے۔ ناول اور افسانے میں فرق یہ ہے کہ ناول میں کسی کردار کی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور مختصر افسانے میں زندگی کا صرف ایک رخ، مزاج کا ایک پہلو اجاگر کیا جاتا ہے۔'' افسانوی ادب کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں۔ ''جدید افسانوی ادب کی مصوری اور تنقید کرتا ہے۔ حیاتِ انسانی کی اہم ترین گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ نفسیات کے پیچیدہ حل اس میں ہوتے ہیں۔ امنگوں اور خواہشوں کے تصادم اور متصادم طوفان یہیں اٹھتے اور ختم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان جو کچھ ہے وہ نہیں نظر آتا ہے۔ اس کی انفرادیت اجتماعیت سے ٹکر لے کر کسی طرح اس پر فتح پاتی ہے یا پاش پاش ہو جاتی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل انسانی رابطہ کے ساتھ انسانوں میں قابل فہم بن جاتے ہیں۔ سماج کے حسن اور غلاظت پر ناقدانہ نگاہ ڈال کر ان میں صحت مندی اور بیماری کے اجزا تلاش کئے جاتے ہیں۔''

وقار عظیم افسانے کی مقبولیت کے اسباب لکھتے ہیں :۔

(۱) اس میں ناول، ڈرامہ، شاعری اور فنون لطیفہ کی خصوصیات موجود ہیں۔

(۲) اس کے پڑھنے میں اتنا کم وقت صرف ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے تھکے ہوئے دماغ کے لئے اسے بہتر دلچسپی سمجھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

(۳) موجودہ زمانے کے رسالوں نے اسے زیادہ ترقی دی ہے۔

(۴) سائنس کی ترقی کے ساتھ اس میں بھی رفتہ رفتہ سائنس کی روح داخل ہوتی جارہی ہے۔

افسانے کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

(۱) **سرخی :-** افسانے کی سرخی دل کش اور جاذبِ توجہ ہونی چاہئے۔ سرخی افسانے پر چھائی ہوئی نہ زیادہ واضح ہو کہ سرخی پڑھتے ہی افسانہ سمجھ میں آجائے اور نہ ایسی مبہم ہو کہ افسانے سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو۔ جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والے کو حیرت میں رکھے۔

(۲) **پلاٹ :-** پلاٹ سادہ ہونا چاہئے۔ مقصد ایک ہونا چاہئے۔ ایک ہی اثر دل میں پیدا کرے، ایک ہی مقام اور مختصر سے مختصر بات میں ختم ہونا چاہئے۔ کردار کا عمل ہر قدم پر نمایاں ہو جس کے اظہار کے لئے افسانہ لکھا گیا ہے۔ پلاٹ میں محل عروج کا ہے۔ کلائمکس یہ وہ موقع ہے جہاں واقعہ اپنی بلندی کو پہنچ جاتا ہے اور پڑھنے والا اس میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ اس کی دنیا صرف افسانہ رہ جاتی ہے۔

(۳) **کردار :-** کردار فطری ہونا چاہئے۔ افسانہ میں حتی الامکان کرداروں کی تعداد کم ہونی چاہئے۔ کردار واضح اور دلکش ہو۔ کرداروں کے نام خیال آفریں ہوں۔

(۴) **مقامی رنگ :-** افسانہ کا تعلق جس ماحول سے ہو، اس میں رنگ پیدا کرنا ضروری ہے، تاکہ افسانہ حقیقت سے قریب ہو جائے اسی ماحول کی زبان کا استعمال ہونا چاہئے۔

(۵) **مکالمہ :-** کردار کے ارتقاء کے لئے مکالمہ مددگار ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ مؤثر، مختصر اور واضح ہو، کرداروں کے الفاظ ان کے دل کی آوازیں ہوں۔ مکالموں کی زبان فطری ہونی چاہئے۔

افسانے کی فنی خصوصیات :-

افسانے کے نئے مزاج کو سمجھانے کے لئے جوگندر پال لکھتے ہیں :-

> ''افسانے کے متعلق بعض نقاد شکایت کرتے ہیں کہ آج کی کہانی شکل وصورت سے کہانی نہیں لگتی ..... آپ کا زمانہ چہرہ دیکھ کر آدمی کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ آج کے لوگ بے چہرگی کے شکار ہیں۔ پہلے عنوان پہلے ہی سے موجود ہوتے تھے اور ان عنوانات پر کہانیاں لکھی جاتی تھیں، آج کہانیاں لکھنے کے بعد

Scanned with CamScanner

کہانی کار کو عنوان کی تلاش ہوتی ہے۔

..... موجودہ کہانی کی شکل وصورت سے ان ہی لوگوں کی کنفیوژن (Confusion) پیش آتا ہے۔ جو کہانی کے کرداروں کو اپنے طور پر جینے بسنے کے جمہوری حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک کردار بس جتے ہوئے گھوڑے ہیں کہ کہانی کار جدھر لگام جھٹک دے ان کا رُخ اسی سمت مُڑ جائے ..... سچی کہانیوں کے کردار اپنی اپنی زندگی کے تجربوں کی روشنی میں اپنا نظریۂ حیات خود آپ مرتب کرتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ کہانی کے طور پر کوئی سچی بات سنا دی جاتی تو اعتراض ہوتا تھا، بھئی یہ کوئی کہانی تھوڑے ہی ہے، یہ تو روزمرہ کی بات ہے۔ جب لوگ سچے تھے، تو کہانی کے جھوٹ سے جی بھر لیا کرتے تھے، پھر جھوٹ عام ہونے لگا تو لوگوں نے کہانی سے اپنی حقیقت پسندی کی تسکین کر لینا چاہی۔

ادب اگر واقعی زندگی کا آئینہ ہے تو اس میں جا بجا کہاوتوں کی تختیاں پڑھنے کی بجائے زندگی کی جھلک پا لینے کا احساس ہونا چاہئے ..... وہ دَور نہ جانے کہاں بہہ گیا، جب لوگوں نے سچ مچ کی زندگی کو بھی جھوٹ موٹ کہانی بنا رکھا تھا۔ زندگی کیا تھی، کوئی کہانی تھی مگر آج ہم نے اس طرح کی کہانی کو زندگی سے خارج کر دیا ہے۔

..... ہر افسانے کے دو تخلیق کار ہوتے ہیں .....

ایک افسانہ نگار اور دوسرا افسانہ نگار کا زمانہ ..... ہر شخص بہ یک وقت اپنی ذات بھی ہے اور ساری لائف ممبری کا مظہر بھی۔

..... نیچر کی کہانی کا جو ازل تا ابد پھیلا ہوا ہے .....

Scanned with CamScanner

زندگی کی حقیقت اس کے قابل یقین واقعات سے ہی رونما ہوتی
ہے، ورنہ صرف قابل یقین واقعات سے زندگی پر ایسی کڑیا کا
گمان ہونے لگے، جسے محض حرکات کے لئے چابی دی گئی۔
..... ایک ہی ذات اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود
بذات خود کہانی کے اسباب مہیا نہیں کر سکتی۔''

سوال ۲: ''واردات'' کا جائزہ تنقید لیجئے۔

جواب: پریم چند کے افسانوں میں غضب کی روانی اور جذبات کا امنڈتا ہوا طوفان ہے۔ پریم چند کے اندر کا فنکار اپنے لئے انفرادی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ان کی نظریں زمانے کی کروٹوں پر تھیں، نت نئے پیدا ہونے والے مسائل پر تھیں، غریب کسانوں اور مزدوروں کی پسماندگی اور زبوں حالی پر تھیں۔ پریم چند نے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت سے ذہنی وفکری انقلاب برپا کر دیا۔ زبان و بیان کی سادگی، سماجی رشتوں کا احساس، طبقاتی آویزش کا شعور، کردار نگاری کی صناعی اور موضوع، مواد اسلوب کی فنکارانہ ہم آہنگی نے اردو افسانہ کو ایک مکمل دنیا عطا کر دی۔ پریم چند وطن پرستی اور قومی جذبے سے سرشار بھی نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے معاصرین کے برعکس اپنے افسانوں میں اپنے وطن عزیز کی وسیع دنیا کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے موجودہ مسائل پر غور و فکر کر کے روز مرہ زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی عمدہ سے عمدہ صورت نکالی۔ انہوں نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ خوشحال ماحول، عقائد اور روایتوں کے پیش نظر پیش کیا ہے۔ پریم چند کا یہ نظریہ اپنے ملک سے محبت کے جذبے کا اظہار ہے۔ وہ اپنے ملک کی غلامی پر خون کے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ اس پس منظر کے پیش نظر ان کے افسانے کا مجموعہ ''واردات'' ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ پریم چند نے ''واردت'' میں ''بدنصیب ماں''، ''مالکن'' اور ''نئی بیوی'' میں عورت کی بے بسی کو اپنا موضوع بنایا ہے کہ کس طرح عورت گھر کو سجاتی اور سنوارتی ہے۔ جس گھر کو وہ اپنا سمجھ کر ایسا کرتی ہے وہ گھر اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ سماج کا قانون اس کی مخالفت میں اپنا حکم صادر کرتا ہے۔ وہ سماج کے قانون کے آگے نوکرانی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا اپنا کچھ بھی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ عورت خواہ ماں ہو، بیٹی ہو یا بیوی ہو۔

Scanned with CamScanner

اس کے برخلاف پریم چند نے ''روشنی''، ''معصوم بچہ''، ''قاتل کی ماں'' وغیرہ افسانوں میں عورت کی عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کی خودداری کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً ''شانتی'' اتنی خوددار عورت ہے کہ وہ پہاڑوں سے ٹکر لے سکتی ہے۔ ''روشنی'' کی ماں جہاں اپنے بچوں کی پرورش کے لئے اپنی عیش و آرام کو تج دیتی ہے تو دوسری جانب افسانہ ''قاتل کی ماں'' دوسرے کی ماں کی آہ وفغاں کو نہ کر کے اپنے بچے کو قاتل قرار دے کر دوسرے کی ماؤں کو خوشی عطا کرتی ہے۔

''واردات'' کے دیگر افسانے مثلاً ''شکوہ شکایت''، ''معصوم بچہ''، ''سوانگ''، ''انصاف کی پولیس'' وغیرہ میں سماجی و معاشرتی برائیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس خیر و شر کی جنگ میں انہوں نے خیر کی ہی جیت دکھائی ہے۔ معصوم اور سادہ لوح انسان جو دنیا کی عیاری و مکاری سے واقف نہیں۔ اس کی بالآخر جیت ہوتی ہے اور وہی شخص صحیح راہ پر گامزن ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے اس افسانوی مجموعے میں زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے سے متعلق اپنے نظریات کی واضح تصویر کشی کرتے ہوئے اس پر بصیرت افروز نگاہ ڈالی اور واضح کرنے کی سعی کی ہے کہ فتح بالآخر نیکی، ایمانداری، دیانتداری، سادہ لوحی کی ہی ہوتی ہے۔ عیار، مکار، فریبی، دھوکے باز ہمیشہ شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔

سوال ۳: پریم چند کے افسانہ ''شکوہ شکایت'' کا جائزہ لیجئے۔

جواب: پریم چند کے افسانہ کی خوبی ان کی حقیقت پسندی ہے۔ جس میں زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر کشی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانہ ''شکوہ شکایت'' میں انسان کے کردار کو ابھارا ہے اور اس کے اثرات سماج پر کیا پڑتے ہیں، اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس افسانہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عورت ایسی ہے جس کی زندگی کا بڑا حصہ گھر ہی میں گذر گیا، اسے کبھی اپنے شوہر سے آرام نصیب نہیں ہوا۔ دنیا کی نظر میں اس کا شوہر نیک، خوش خلق اور فیاض ہے۔ اس کا شعار سماج کے گرے ہوئے طبقے کے لوگوں کی عزت کرنا ہے، ان کو اوپر اٹھانا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی فکر میں گھلے جاتے ہیں۔ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ دوستوں کی مہمان داری اور حاجتوں کی تکمیل میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ ان کا خاص کام لوگوں کی امداد ہے۔ خود گھر پر کوئی مصیبت آن پڑے۔ ان کو اس کی ذرہ بھر بھی فکر نہیں۔ ان کے کاموں کی وجہ سے بیوی سخت پریشان رہتی ہے۔ جب

Scanned with CamScanner

کوئی چیز ان کی بیوی لانے کو کہتی ہے تو ایسی دکانوں سے لاتے ہیں، جہاں گلی سڑی چیزیں ملتی ہیں۔

ان کی فیاضی سے ان کی بیوی سخت پریشان ہے۔ ان کی بیوی کے پاس کوئی چیز ہو یا نہ ہو لیکن اگر دوسرے مانگنے کے لئے آجائیں تو فوراً دے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ پہننے کے کپڑے بھی کوئی مانگے تو دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ ایک بار کا قصہ ہے کہ ایک مہتر نے اتارے کپڑے کا سوال کیا۔ انہوں نے فوراً اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ ان کے ایک بھائی صاحب تحصیل دار ہیں، گھر کی ساری جائداد ان ہی کی نگرانی میں ہے۔ بیمہ کمپنی کے روپے کرتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی صاحب سے خط لکھ کر منگوا لیجئے لیکن وہ ٹال گئے۔

اور تو اور، یہ اپنے دوستوں پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ ایک بار زیور بنانے کو دیا گیا تو انہوں نے آدھا تانبا اور آدھا سونا ملا کر جیسے تیسے بنا کر دے دیا۔

خدا کے فضل سے ان کے دو بچے دو بچیاں ہیں۔ جب بچی کی شادی کا وقت آیا تو جہیز کے نام سے بھڑک اٹھے۔ کسی طرح سے اس کی شادی ہوئی، کئی دنوں تک بول چال بند رہی۔

دراصل پریم چند اس افسانہ میں ایک ایسے انسان کی تصویر کشی کرتے ہیں جو بالکل سیدھا سادا ہے۔ سماج کے لوگ اسے کس کس طریقے سے بے وقوف بناتے ہیں اور یہ شخص بیوقوف بنتا بھی جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ بیوقوف ہے، بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ وہ سماج کے لوگوں کا درد اپنے دل میں رکھتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے زندہ ہے۔ خود اس کی زندگی کتنی مصیبتوں میں ہے اس کی فکر اس کو ذرہ برابر نہیں ہے۔

اس کے کردار کے ذریعے پریم چند یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ایسے کردار کی وجہ سے ہی دنیا میں زندگی قائم ہے۔ اس طرح کے لوگ ہی دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔ خود ان کی بیوی جو ان کے ہر اعمال و افعال کی مخالفت کرتی ہے۔ لیکن ان کو اپنے دل کی گہرائی سے چاہتی ہے۔ ان کی بیوی کہتی ہے "مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انہیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے، جن پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود معلوم نہیں۔"

پریم چند نے افسانہ "شکوہ شکایت" کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی

Scanned with CamScanner

سماجی اور اصلاحی رجحانات سے متاثر ہو کر بھی انہوں نے کئی افسانے لکھے۔ ''آشیاں برباد'' خاص طور پر عورتوں کی جدو جہد آزادی کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہندوستانی عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی حکومت کے خلاف لڑنے اور اپنے حقوق و مراعات حاصل کرنے کا درس دیا۔

''وال قیدی''، ''آخری تحفہ''، ''جیل''، ''سہاگ کی ساڑی''، ''جلوس''، ''برات''، ''لال فیتہ''، ''بھولے ننو'' وغیرہ اس موضوع پر ان کے بہترین افسانے ہیں۔

اپنے افسانوی سفر میں انہوں نے ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا۔ اور شاید ہی ایسا گوشہ بچا ہو جس پر ان کی نظریں مرکوز نہ ہوئی ہوں۔ دورِ آخر میں ان کی رومانیت اور تصور پرستی میں کمی آنے لگی۔ آخری وقت میں انہوں نے ایک شاہکار افسانہ ''کفن'' دیا۔ جو اردو افسانے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''کفن'' اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی اخلاقی پستی اور تہذیبی زوال کا بہترین انعکاس ہے۔ غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانے کا بجھا ہوا الاؤ پورے ہندوستانی سماج اور معاشرے کی علامت ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں :

''پریم چند نے ''کفن'' میں ایک مخصوص معاشی نظام میں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے دو انسانوں کی زندگی کے خارجی اور داخلی کوائف کو بیان کئے ہیں۔ ان میں مشاہدہ، فکر اور تخیل کی تیزی، گہرائی اور وسعت نے مل جل کر پوری طرح آہنگ ہو کر اپنا کام پورا کیا۔''

سوال ۵: افسانے کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

جواب: اردو میں افسانہ بیسویں صدی کی دین ہے۔ افسانہ کی تاریخ میں سرِفہرست پریم چند کا نام آتا ہے۔ ''پریم پچیسی'' اور ''پریم بتیسی'' نے افسانہ نگاری پر بہت اثر ڈالا۔ پریم چند کا مطالعہ گہرا تھا۔ روز مرہ کے واقعات، دیہاتی زندگی کی تصویریں، تاریخ اور نیم تاریخی واقعات ان کا موضوع ہیں۔ زبان صاف اور شگفتہ، انداز بیان بے تکلف، ان کے طرز تحریر کی خصوصیات ہیں۔

پریم چند کا مرتبہ افسانہ نگاری میں ممتاز ہے۔ پنڈت بدری ناتھ سدرشن نے بھی افسانہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ نقطۂ نظر اصلاحی ہے۔ زبان و خیال دونوں سادہ ہیں، جذبات میں

Scanned with CamScanner

جوش پیدا کرتے ہیں۔ مقامی رنگ بھی آپ کے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ کردار نگاری پر خصوصی توجہ رہی ہے۔ دیہات اور شہر دونوں افسانوں کے موضوع ہیں۔

کرشن چندر کا شمار ترقی پسند مصنفین میں ہوتا ہے۔ دنیا کے تکلیف دہ واقعات پیش کرتے ہیں۔ مزدور اور متوسط دونوں طبقے کی نمائندگی اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی کرشن چندر کا شعار ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

پطرس بخاری بھی مزاح پسند تھے۔ انہوں نے دوسروں کے مقابلے میں کم لکھا، لیکن اچھے مضامین اور افسانے لکھے۔ مزاح میں فطری انداز ہے۔ بناوٹ نہیں پائی جاتی، کردار نگاری کا کمال پایا جاتا ہے۔ کردار کا ارتقاء ان کے یہاں بہت خوب ہے۔ چند ہی مضامین ہیں، لیکن ہر ایک اپنی نوعیت میں بہت خوب ہے۔

سعادت حسن منٹو کا موضوع گندگی اور گنہگار دنیا کے رہنے والے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جنسیات کا غلبہ ہے۔ اندازِ بیان میں عریانیت اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ بیان رواں ہے۔ کج رو اور ہوا و ہوس کے شکار طبقہ کی ذہنیت خوب سمجھتے ہیں اور اس کی ترجمانی اچھی طرح کرتے ہیں۔

سلطان حیدر جوش نے ''افسانہ جوش'' اور ''فکر جوش'' دو مجموعے لکھے۔ ان کی زبان میں شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ تبلیغی اور اصلاحی مقصد ان کے یہاں نمایاں ہو جاتا ہے، جو افسانے کا عیب ہے۔ کہیں کہیں تمہید طول ہو جاتی ہے۔ یورپ کی اندھی تقلید اور کبھی سماجی مسائل ان کا موضوع ہیں۔

نیاز فتحپوری کے افسانوں کے دو مجموعے ''نگارستان'' اور ''جمالستان'' شائع ہوئے ہیں۔ وہ دلکش عبارت لکھتے ہیں۔ عربی الفاظ اور فارسی کی ترکیبیں لکھتے ہیں۔ الفاظ کی بندش چست ہوتی ہے۔ ان کے افسانے کی امتیازی خصوصیت کردار نگاری ہے۔ ان کے افسانے خالص رومانی ہیں۔ حسن و عشق ان کا موضوع ہے۔ نہ اخلاقی تعلیم ہے نہ اصلاحی نقطۂ نظر۔ تخیل کی دنیا میں پرواز کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی کے تمام افسانے تخلیقی ہوتے ہیں۔ سیرت نگاری کا عنصر ایک خاص چیز ہے۔ ان کے پلاٹ نہایت دلکش ہوتے ہیں۔ جن میں ظرافت کا لطف بھی ملتا ہے۔ زبان سادہ اور عربی فارسی الفاظ سے کترائی ہوئی نکل جاتی ہے۔ ان کا موضوع بس زیادہ تر دیہات ہے۔ پریم چند سے کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ''آئی سی ایس پاس''، ''پھول اور کچھ ہنسی نہیں ہے'' کے ناموں سے ان کے افسانوں

Scanned with CamScanner

ے ہوئے شائع ہو چکے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نے سب سے پہلے دوسری زبانوں سے افسانوں کے ترجمے کئے۔ ترکی افسانوں کا ترجمہ شروع کیا۔ ان کے افسانوں کی زبان شاعرانہ ہے۔ نفسیاتی تجزیہ ان کے افسانوں کی جان ہے۔ انگریزی افسانوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے دو مجموعے شائع ہوئے۔

مردوں کے دوش بدوش افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی بھی ممتاز ہو چکی ہیں۔ ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہے۔ عبارت صاف، سادہ، رواں ہوتی ہے۔ طنز اور مزاح دونوں ان کے یہاں ملتے ہیں۔ کہیں کہیں بے باکی، عریانیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی بھی مزاحیہ افسانہ نگار ہیں اور مزاح کو اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پلاٹ بڑے دلکش ہوتے ہیں۔ ''شریر بیوی'' اور ''کولتار'' ان کے بہترین افسانے ہیں۔ زبان اور محاورے پر ان کی نظر نہیں رہتی ہے۔ عام رسم و رواج پر ان کے افسانے کی بنیاد ہے۔

رشید احمد صدیقی اردو کے بہترین اور بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ طنز و ظرافت میں شگفتگی اور ستھرا پن پایا جاتا ہے۔ ان کے لطیف اشارے قاری کے ذہن میں کھلبلی پیدا کر دیتے ہیں۔ اشاروں اشاروں میں تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قاری کو اپنی سطح بلند کرنی پڑتی ہے۔ ہر شخص ان کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

ان کے علاوہ شوکت تھانوی، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، اختر رائے پوری، حسن عسکری، ممتاز، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، حجاب امتیاز علی تاج، فرحت اللہ بیگ وغیرہ اچھے افسانہ نگار ہیں۔

سوال ۶: پریم چند نے اپنے افسانہ ''معصوم بچہ'' کے ذریعہ جن معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اسے تحریر کیجئے۔

یا افسانہ ''معصوم بچہ'' کا جائزہ لیجئے اور اس افسانہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

یا افسانہ ''معصوم بچہ'' میں ایک بے بس عورت کی تصویر پیش کی گئی ہے، اس پر تبصرہ کیجئے۔

جواب: پریم چند نے جتنی کہانیاں لکھی ہیں، وہ ایک خاص مقصد کے تحت لکھی ہیں۔ پریم چند کی کہانیاں کرداروں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ واقعات کا ارتقاء ان کے آدرش کی وضاحت کرداروں

Scanned with CamScanner

کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کے تمام کردار عموماً مثالی ہوتے ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کی خامیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ خامیاں خوبیوں اور اعلیٰ صفات کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کے کردار آہستہ آہستہ ارتقاء کی طرف بڑھتے ہیں۔ اپنے مقصد کو نمایاں کرنے کے لئے وہ پہلے سے کرداروں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کی تفصیلات میں خاصی طوالت سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نسلی خصوصیات، مالی حالت اور طرز معاشرت کے متعلق مکمل معلومات فراہم کر لیتے ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں میں تقریباً وہ تمام کردار موجود ہیں، جو سماج کے کسی نہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تمام کردار عادات و اطوار اور خصوصیات کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔

پریم چند کی کہانیوں میں واقعات اور کرداروں کی کمی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ماہر داستان گو کی طرح کہانی میں جاذبیت اور کشش پیدا کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ وہ واقعات کی نوک پلک کو بڑے فنی شعور کے ساتھ سنوارتے ہیں اور کرداروں کو واقعات کی مناسبت سے حرکت عمل کا اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے کرداروں کا نفسیاتی ارتقاء بڑے فطری انداز میں ہوتا ہے۔ کرداروں میں اندرونی اور بیرونی حالات سے پیدا شدہ تصادم ان کا ذہنی ردّ عمل اور ان کی حرکات و سکنات کے اسباب و علل کا تجزیہ بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔

پیش نظر افسانہ ''معصوم بچہ'' میں پریم چند گنگو برہمن کے ذریعے سماج میں پیدا شدہ برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گنگو اس افسانہ کا ایسا کردار ہے، جس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس کو اپنے کام سے کام ہے۔ دوسروں کی طرح وہ خوشامد پرست یا چغل خور نہیں ہے۔ وہ ایک زمیندار کے یہاں نوکر ہے۔ دوسرے نوکر سائیس زمیندار کو زور زور سے سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ خوددار ہے۔ خوشامد پسند نہیں۔

ایک دن گنگو اپنے مالک سے کہتا ہے کہ ''اب آپ مجھے کام سے چھٹی دے دیجئے۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا''۔ اس قسم کی یہ پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خود داری کو چوٹ لگی۔ میں اس درخواست سے حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا ''کیوں کیا شکایت ہے؟'' گنگو نے کہا ''حجور! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ نیک طبیعت ہیں، لیکن

Scanned with CamScanner

بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس سے آپ کی بدنامی ہوگی۔'' گنگو نے مجبر معذرت بن کر کہا کہ ''وہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے، اس سے میں بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا ''کیا تم گومتی سے شادی کرنا چاہتے ہو، کیا تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا؟ جانتے نہیں یہ عورت تین بار اپنے شوہروں کو چھوڑ چکی ہے اور بھاگ گئی ہے۔ اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ تم اس سے شادی کرو۔'' مگر اس نے بہت اصرار کیا اور اس کی تعریف کرتا رہا۔ آخر زمیندار نے اسے ملازمت سے علیحدہ کردیا۔ اس کے بعد گنگو گومتی سے بیاہ رچالیتا ہے۔

اس طرح اس افسانہ کے ایک پلاٹ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ دوسرے پلاٹ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ گنگو کو گومتی سے شادی کئے ہوئے پانچ ماہ گذر گئے۔ وہ اس محلے میں ایک کھپریل مکان لے کر رہتا ہے۔ جہاں وہ چاٹ کا خوانچہ لگا کر گذر بسر کرتا ہے۔ اس سے پریم چند یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان بُرا نہیں ہوتا، بلکہ حالات اسے بُرا بنادیتے ہیں۔ گومتی بھی ایک شریف عورت ہے لیکن حالات نے اسے ایسا بنادیا تھا۔

ایک دن زمیندار نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔ ان کو پورا یقین تھا کہ گنگو کو بھی گومتی ضرور دغا دے گی۔ جب گنگو نے آکر کہا ''بابو جی! گومتی مجھے دھوکہ دے گئی۔'' تو مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن اس نے کہا ''بابو جی! وہ گھر سے ایک دھیلے کی چیز نہیں لے گئی۔'' وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔''

ایک مہینہ کے بعد جب زمیندار نینی تال سے واپس آئے تو گنگو ایک نوزائدہ بچے کو گود میں لئے کھڑا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔ اس نے بچے کو میری طرف بڑھایا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے کہا ''یہ تمہارا ہی لڑکا ہے نہ؟ ابھی تمہاری شادی کے چھ مہینے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا ''میرا کاہے کو ہے، بابو جی آپ کا ہے، بھگوان کا ہے۔'' میں نے کہا ''چھ مہینے میں لڑکا ہوتے آج ہی سنا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''مجھے تو بابو جی اس کا خیال بھی نہ رہا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی۔ میں نے گومتی سے کہا اگر تمہارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہے تو مجھے چھوڑ دو۔ میں جہاں تک ہوسکے گا، تمہاری مدد کروں گا۔ میں نے تم سے اس لئے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو۔ میں تمہیں اس لئے چاہتا ہوں کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ یہ بچہ میرا ہے۔ میرا اپنا ہے۔ میں نے ایک بویا ہوا

Scanned with CamScanner

کھیت لیا تو اس کی پھسل کو اس لئے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی کسی دوسرے نے بویا تھا۔'' یہ کہہ کر گنگو زور سے ہنسا۔

میں کپڑا اتارنا بھول گیا۔ دلی کراہیت کے باوجود اسی حالت میں میں نے بچہ کو گود میں لیا اور پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا کبھی نہ لیا ہوگا۔ میں گنگو کے ساتھ گومتی سے بھی ملنے گیا۔

اس افسانہ کے ذریعے پریم چند یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کے اندر اگر شرافت ہوگی تو وہ ایک ذلیل انسان کو بھی اشرف بنا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں گنگو کا کردار ایک اعلیٰ انسان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

سوال ۷: پریم چند کے افسانہ ''بدنصیب ماں'' کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

یا افسانہ ''بدنصیب ماں'' کے ذریعے پریم چند نے ہندوستانی ماؤں کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ کیسے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: پریم چند کے فن کا وصف جمہوری اور عوامی انداز ہے۔ ان کا فن حیاتِ انسانی کی مختلف النوع پہلوؤں کی حقیقت افروز عکاسی کرتا ہے۔ دیہات کی سادگی اور سچائی ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ ان کا قلم فنکارانہ صداقت کی راہ سے کبھی بھی منحرف نہ ہوا۔ ان کے فن نے عقل وشعور کی روشنی میں ایسی راہ منتخب کی جس کی منزل ارضیت، جمہوریت، اجتماعیت اور انسانیت کی اعلیٰ قدریں تھیں، ان کے فن نے ادب میں نئی بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کردی اور ذہنی وفکری زندگی کے دھارے کا رخ اپنے دور کے داعیات ومطالبات کی طرف موڑ دیا۔ بلاشبہہ ان کے فن کی معراج تھی کہ ارضی وجمہوری قدریں صداقت کے سانچے میں ڈھلنے لگیں اور فرد وسماج کے مابین جذباتی رشتوں میں ہم آہنگی اور ربط کا ایک نیا شعور پیدا ہونے لگا۔

پریم چند کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت ایک دیہاتی زندگی کی سچی اور صحیح تصویر کشی ہے۔ اس تصویر کشی میں لطف وکیف کے ساتھ غم انگیز پہلو بھی شامل ہیں۔ یہ ان لوگوں کی تصویریں ہیں جنہیں ہم چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ان کے افسانہ کا موضوع عورت اور اس کی زندگی سے بھی ہے۔ عورت کو سماج کا پست طبقہ مانا جاتا ہے۔ وہ ہر ظلم کو مسکراتے ہوئے جھیلتی ہے۔ مگر اُف تک نہیں کرتی۔ عورت ایک ماں کی صورت میں بچوں کی پرورش وپرداخت کرتی ہے۔ اس لئے ہر مصیبت کو برداشت کرتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ وہی بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو اسے ہر طرح سے ستاتا ہے۔ عورت بیوی کی صورت میں اپنے شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ عورت بہو کی صورت میں اپنے سسرال میں ساس سسر، نند بھاوج، دیورانیوں اور دیوروں کی ہر طرح دیکھ بھال کرتی ہے۔ لیکن وہی افراد اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے میں دریغ نہیں کرے۔

افسانہ ''بدنصیب ماں'' ایک بدنصیب عورت کی کہانی ہے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے۔ باپ کی موت اس وقت ہوئی جب چاروں بیٹے جوان ہو گئے۔ ایک لڑکی بھی چھوڑی جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ نے اپنے شوہر کی زندگی میں عیش وعشرت کو ترک کر کے اور روپے جمع کر کے مکان، باغ اور زیور وغیرہ خریدے تھے تا کہ بڑھاپے میں آرام ہو۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ جب تک اس کا شوہر زندہ رہتا ہے اس وقت تک اس کے حکم کو حرف آخر مانا جاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد اس کے حکم کے مطابق کچھ نہیں ہوتا۔

پنڈت اجودھیا ناتھ کے انتقال کے بعد ان کے چاروں لڑکے اور ان کی بیویاں من مانی کرنے لگتے ہیں۔ وہ سماج کا بھی خیال نہیں کرتے۔ وہ اپنی ماں کو ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور بالآخر یہ بدنصیب ماں گنگا میں ڈوب کر بے بسی کی موت مر جاتی ہے۔

افسانہ ''بدنصیب ماں'' میں پریم چند نے ایک عورت پر قانون کے تحفظ کا مسئلہ اٹھایا ہے کہ قانون اس کو کیا تحفظ دیتا ہے۔ جب پنڈت اجودھیا ناتھ کا انتقال ہو جاتا ہے تو ان کے چاروں لڑکے ان کی جائداد کے دعویدار ہو جاتے ہیں۔ اس پر ان کی ماں پھول متی کہتی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں، یہ ساری دولت میری ہے۔ میرے مرنے کے بعد یہ تم لوگوں کی۔ اس پر اس کا ایک بیٹا رما کہتا ہے کہ ماں تم کیسی باتیں کرتی ہو، اب اس جائداد پر تمہارا کچھ بھی حق نہیں رہا۔ سب کچھ ہمارا ہے۔ یہ حکومت کا قانون ہے۔ اس پر پھول متی کہتی ہے یہ قانون کس نے بنایا۔ سبھی لڑکوں نے کہا یہ قانون رشی منیوں نے بنایا ہے۔ اب صرف تم کو اپنی گذر بسر کے لئے ملے گا۔

اس افسانہ کا مرکزی خیال یہ ہے پنڈت اجودھیا ناتھ اپنے مرنے کے بعد چار بڑے بیٹے، ایک بیٹی جس کی منگنی مراری لال سے ہو چکی تھی اور ایک بیوی چھوڑتے ہیں۔ پنڈت اجودھیا ناتھ کی موت کے بعد بہورانیاں اور بیٹے اپنی ماں سے بُرا سلوک کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب

Scanned with CamScanner

شادی کی بات ہوتی ہے تو مراری لال سے رشتہ توڑ کر بھائیوں نے کمد کی شادی دیدیال سے کردی۔ جس کی عمر چالیس سال تھی۔ اس کی ماں، بیٹوں کی ان تمام حرکتوں کو دیکھتی رہی۔ کچھ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اب اس کی حیثیت اس گھر میں ایک ملازمہ سی تھی۔

پھول متی روزانہ صبح سویرے اٹھتی ہے، مکان کی صفائی کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے، ایک تنگ اور چھوٹے کمرے میں رہتی ہے اور اس کے چاروں بیٹے اس طریقے سے اسے دیکھتے ہیں کہ جیسے یہ سارے کام اسی کے ہیں۔ آخر میں پھول متی اپنے بڑے بیٹے اوما کے لئے پانی لانے گنگا جاتی ہے تو اس کا پیر پھسل جاتا ہے۔ گنگا کا پانی بڑھا ہوا تھا۔ اس پانی میں سے اسے کوئی نہیں نکالتا اور وہ ڈوب کر مر جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منشی پریم چند نے اپنے اس افسانہ میں ایک بدنصیب ماں کی سچی تصویر کشی کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سماج کا قانون غلط ہے۔ جو عورت زندگی بھر اپنے شوہر کی کمائی سے ایک ایک پیسہ جمع کر کے جائداد حاصل کرے اس پر حکومت کا یہ قانون غلط ہے کہ اس کا کچھ بھی حق نہیں ہے۔ حکومت کے قانون پر پریم چند کی بہت بڑی تنقید ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سرکار قانون میں تبدیلی کرے۔ تاکہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کی جائداد میں اس کی بیوی کا بھی کچھ حق ہو۔ وہ بالکل محروم نہ رہے۔ تاکہ اس کی زندگی دشوار نہ ہو۔

Scanned with CamScanner

رستم وسہراب

آغا حشر کاشمیری

سوال ۱: آغا حشر کاشمیری کی ڈرامہ نگاری کا جائزہ لیجئے۔

جواب: ہندوستان میں اگر چہ ڈرامہ نگاری کا فن تیار نہیں تھا۔ مگر فنی لحاظ سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ شروع میں ڈرامے صرف مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لئے ''رام لیلا'' اور ''کرشن لیلا'' کے ناموں سے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اسٹیج پر پیش کئے جاتے تھے۔ مہابھارت اور رامائن کے یہ قصے صرف تفریح کے ذرائع تھے۔ کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی اور ان میں زندگی کی کسی شدت کی وضاحت پیش کی جاتی تھی جس میں تفریح کے ساتھ کار خیر کا جذبہ غالب رہتا تھا۔ ایک مدت تک ہندوستان ڈرامہ اسی کار خیر کے جذبے تلے سسکتا رہا۔

آغا حشر کاشمیری نے جس وقت ڈرامہ کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت اردو ڈرامہ کی یہی روش تھی۔ اور اسٹیج کی دنیا میں کامانت لکھنوی، مداری لال، رونق بنارسی، عبداللہ بیگ، نظیر اور حسینی میاں ظریف کے کارناموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے ڈرامے اردو کے قدیم داستانوں سے ماخوذ ہیں اور فی الفطرت کرداروں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ جا بجا ٹھمری، داور اور سستی قسم کی ظرافت سے دیکھنے والوں کی تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ ان کے بعد ونائک پرساد، طالب بنارسی، میر مہندی حسن، احسن لکھنوی اور پنڈت نرائن پرساد بنیاب کا زمانہ آیا۔ ان حضرات نے اردو ڈراموں میں قابل قدر تبدیلیاں کیں۔ غیر ضروری ابتدال سے پرہیز کیا اور زندگی کے سنجیدہ عناصر کو ڈراموں میں جگہ دینے لگے۔ طالب بنارسی نے انقلاب انگیز قدم اٹھا کر اردو ڈراموں میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی۔ انہوں نے پیش کش کا منظوم طریقہ ختم کر کے نثر کا استعمال شروع کیا۔ اس سے اردو ڈراموں کی جاذبیت بڑھ گئی اور مکالموں کی طوالت بھی ختم ہو گئی۔ لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھی اور ڈرامہ کی فضا میں اپنائیت کا احساس ہونے لگا۔

آغا حشر کے پہلے دور کی ڈرامہ نگاری میں یہ اثرات غالب ہیں لیکن ان کی یہ جدت پسندی

Scanned with CamScanner

زیادہ دنوں سے تقلید کی متحمل نہ ہوسکی اور بہت جلد انہوں نے اپنے لئے نئی راہ نکالی۔ انہوں نے تصنع اور بناوٹ سے اسٹیج کو آزاد کیا۔ زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کیا۔ کرداروں میں زندگی کی لہر پیدا اور مکالموں کو جذبات و خلوص سے آراستہ کیا۔ ڈرامہ میں گھریلو پن کی فضا پیدا کی اور بعید از قیاس واقعات سے ڈرامہ کو پاک کر دیا۔ اس طرح آغا حشر کی رہنمادی روش نے اردو ڈرامہ کو فنی اقدار کا حامل بنایا اور وہ خود بھی اپنے دور کے ممتاز منفرد ڈرامہ نگار بن گئے۔

آغا حشر کے وہ ڈرامے جو مغربی ماخذ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں عام روش کے مطابق مقفی عبارت زور خطابت، اشعار کی بھرمار گانوں کی کثرت اور جذبات کا طوفان امنڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ چونکہ تمام لوازم ڈرامہ کی کامیابی کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔ اسی لئے ان سے دامن کش ہونا آغا حشر کے لئے ممکن نہ تھا۔ دوسرا اہم پہلو تجارتی نقطۂ نظر سے انہیں پسندیدہ بناتا تھا۔ اسی لئے کسی ڈرامہ نگار کے لئے ان تمام جزئیات سے دست بردار ہونا آسان نہ تھا۔ جو تفریح کے ساتھ تجارتی سطح پر کامیابی کی ضامن ہوں۔ آغا حشر پر بھی یہ پابندیاں عائد ہوتی تھیں، اس لئے وہ اپنے پہلے دور کے ڈراموں میں جدّت پسندی کا کوئی ثبوت نہ دے سکے۔ مگر جلد ہی آغا حشر کی ڈرامہ نگاری کا دوسرا دور کہا جا سکتا ہے۔ اگر چہ انہوں نے عام روایت سے انحراف نہیں کیا۔ قافیہ کا التزام گانوں کی کثرت بدستور رہی۔ مگر مکالموں کی طوالت ختم کر دی۔ جھوٹے جھوٹے فقروں سے جذبات کی عکاسی اور ڈرامائی عناصر کو ابھارنے میں مدد کی۔ سلیس اور رواں عبارت لکھنے لگے۔ تصادم اور کشمکش کی کیفت کو کم از کم الفاظ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی جس سے اداکاروں کو تاثرات کے اظہار میں آسانی ہوگئی۔ پیش کش کا یہ انداز عوام میں بے حد مقبول ہوا۔

جب آغا حشر مغربی اور مشرقی ماخذات سے کنارہ کشی کر کے طبع زاد ڈرامے لکھنے لگے تو ان کے فن نے حیرت انگیز طور پر انگڑائی لی۔ انہوں نے ڈراموں میں معاشرتی اور اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ انہوں نے جیتی جاگتی زندگی سے کردار کے لئے زندگی کے تابناک اور المناک دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا انہوں نے جیتی جاگتی زندگی کی حقیقتوں کو ڈرامہ میں پیش کر کے تاریخی، نیم تاریخی، مذہبی، اصلاحی موضوعات پر حقیقت پسندانہ موڑ پیدا کئے اور انہیں زندگی کا ترجمان بنایا۔ کردار نگاری پر توجہ صرف کی مرکزی اور ثانوی کرداروں میں فاصلہ قائم کیا۔ اور جذبات میں ثروت اور تصادم کی کیفیت سے ڈرامہ

Scanned with CamScanner

کے ذریعہ زندگی سے محبت کرنے کا سلیقہ سکھایا۔تہذیب وشائستگی سکھائی۔مایوسی اور نا امیدی سے بچایا۔

اس طرح انہوں نے اصلاح معاشرت کا جو فریضہ انجام دیا وہ ان کی ڈرامہ نگاری کا روشن ترین باب ہے۔شراب، قمار بازی اور طوائف کے وجود سے سماج میں جو برائیاں آ گئی تھیں اور ان سے جو زندگی پر عبرت ناک مسائل پیدا ہو گئے تھے، آغا حشر نے اپنے ڈراموں کے ذریعے ایک مصلح قوم کی طرح ان سے خبردار کیا ہے۔اور آنے والی نسلوں کو آگاہی دی کہ برائی خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، بہر حال برائی ہے۔اور اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔زندگی کی آفاقی قدروں کو جتنے فنی شعور کے ساتھ آغا حشر نے اپنے ڈراموں میں برتا ہے، اس کی مثال ان کے ہم عصر ڈرامہ نگاروں میں نہیں ملتی۔ زور خطابت ہو، جذبات کی شدت ہو، خیالات کا طوفان ہو، اشعار کی بھرمار ہو، قافیہ پیمائی کا التزام ہو۔ مکالموں کی گھن گرج ہو یا ہلکے سروں میں نغمہ سرائی ہو، آغا حشر کا اصلاحی جذبہ لفظ لفظ میں پوشیدہ ہے۔ یہی وہ تعمیری جذبہ ہے، جو ان کے ڈراموں کو مہتم بالشان بناتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے فرد اور سماج کے درمیان کشاکش اور تصادم کی جو فضا اپنے ڈراموں میں پیدا کی ہے، اس سے زندگی کی شدت اور وحدت عمل کی مرکزی خصوصیت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔اور یوں آغا حشر نے اپنی ژرف نگاہی، جدت پسندی اور وسیع مطالعہ کے سبب فن ڈرامہ نگاری کو ارتقا کی منزلوں سے قریب تر کر دیا ہے۔اپنے ڈراموں میں وسعت گہرائی، سبق آموز مقصد اور ادبی رجحانات پیدا کرنے کے لئے حشر کو کن کن منزلوں سے گذرنا پڑا، انہیں کی زبان سے سنیئے :-

> ''میں جب کوئی ڈرامہ لکھنے کا خیال کرتا ہوں تو پہلے اس کے موضوع پر تمام معلومات جمع کر لیتا ہوں اور اس وقت تک اس پر قلم نہیں اٹھاتا، اس کی تمام تفصیلات پر نہ حاوی ہو جاؤں۔میں وقت اور سوسائٹی کی حالات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔اور اس کے مطابق اپنا اصلاحی پروگرام مرتب کرتا ہوں۔میں نے مقفیٰ بے سر پا ڈراموں کو جن کا آج سے بیس برس پہلے تک بہت رواج تھا، اسٹیج کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔لیکن مجھے پبلک کو ادبی ڈرامے کے لئے تیار کرنے کی خاطر کئی برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔''

یہی لگن، یہی جذبہ، یہی فنکارانہ صداقت تھی جس نے اردو ڈرامے کو نئی زندگی عطا کی اور یہاں کے فن کا کرشمہ ہے کہ وہ آج تمام اردو ڈرامہ نگاروں کی صف میں ایک ممتاز منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

سوال ۲: اردو میں ڈرامہ کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالئے اور اردو میں بہترین ڈراموں کی نشاندہی کیجئے۔

جواب: ارتقاء کے سفر میں اردو ادب کے سامنے دو نمونے ہو سکتے تھے۔ ایک فارسی اور دوسرا سنسکرت۔ قدیم ہندوستان میں ڈرامہ اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ سنسکرت میں اعلیٰ پائے کے ڈرامے لکھے گئے۔ لیکن جس طرح دوسرے اصناف سخن اردو سنسکرت کے قدیم ادبی سرمایہ سے بہتر نہ ہو سکی اسی طرح اردو فن ڈرامہ پر بھی سنسکرت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی صورت حال پر تاریخی اور تہذیبی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ جنہیں تاریخی و تہذیبی عناصر نے اردو کو فارسی کے قریب رکھا۔ اردو کو فارسی سے ڈرامہ کا کوئی نمونہ نہیں ملا۔ لہٰذا اردو میں ڈرامہ کے آغاز کو انیسویں صدی کے وسط تک ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں یوروپی اثرات کا داخلہ ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیقات کے مطابق سب سے پہلے پرتگالیوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے "تماشے" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا۔ پھر انگریزوں نے ۱۷۵۰ء میں بمبئی تھیٹر کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۰۲ء میں یہ تھیٹر بند ہو گیا۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں جگناتھ سیٹھ نام کا ایک شخص نے بمبئی میں ایک نئے تھیٹر کا اجرا کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو ڈاکٹر لاؤ نے "راجہ گوپی چند اور جالندھر" تماشہ ایک تھیٹر میں دکھایا۔ اس کے بعد اردو تھیٹر کو آگے بڑھانے میں پارسیوں نے خوب حصہ لیا۔ ان لوگوں نے ۱۸ فروری ۱۸۵۳ء کو نیم حکیم اور قتل عام ڈرامہ بمبئی میں اسٹیج کیا۔ اسی عہد میں واجد علی شاہ نے بھی اردو ڈرامہ لکھا اور کھیلوایا۔ رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ زبان اردو کے مطابق سب سے پہلے اردو ڈرامہ اندر سبھا ہے۔ جس کو امانت سا گرنج نے ۱۸۵۳ء نے تصنیف کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیق کے مطابق واجد علی شاہ نے اردو میں سب سے پہلے رادھا اور کنہیا ڈرامہ لکھا۔ جس میں غربت زعفران پری، کنہیا اور رادھا جیسے تمثیلی کردار ملتے ہیں۔ یہ ڈرامہ ۱۸۴۳ء میں پہلی دفعہ شاہی محل میں کھیلا گیا اور واجد علی شاہ نے تین ڈرامے لکھے۔ امانت کی اندر سبھا منظوم ہے۔ اسکی زبان بہت آسان سلیس اور سادہ ہے۔ اس میں رعایت لفظی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس ڈرامہ کی نہ صرف یہ تاریخی بلکہ ادبی اہمیت بھی موجود ہے۔ اس

Scanned with CamScanner

میں قافیہ بندی اور ترنم سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس میں رقص اور مثنوی کی بھی خصوصیات ہیں۔

کہانی اور انداز بیان کے اعتبار سے مثنوی جیسی ہی ہے اور چونکہ اس ڈرامے میں رقص اور گیت زیادہ ہے اس لئے اسے اوپیرا بھی کہا جا سکتا ہے۔ امانت کی اندر سبھا کے طرز پر کئی دوسرے اندر سبھائیں لکھی گئیں لیکن ان میں نہ فنی محاسن ہے اور نہ ہی ڈرامائی شان۔ اس سلسلے میں مداری لال کے اندر سبھا کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جو ادبی حیثیت سے امانت کے مقابلہ کی چیز نہیں، لیکن اس میں ڈرامائی انداز نسبتاً زیادہ ہے۔

اس کے بعد اردو ڈرامہ نگاروں کی صف سامنے آئی۔ جن میں حسن لکھنوی، رونق بنارسی، طالب بنارسی، بے تاب ظریف قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھتے تھے۔ ظریف اچھے ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے چاند بی بی، گل بکاؤلی، بدر منیر، شیریں فرہاد، حاتم طائی جیسے ڈرامے لکھے۔ احسن لکھنوی مصنف واقعات انیس ''چندراوتی اور دل فروش'' پر شکسپیئر کے ڈرامے روسیوں جیولیت اور سملیت کے گہرے اثرات ہیں۔ نرائن پرساد بیتاب نے قتل نظیر اور گورکھ دھندا جیسے ڈراموں کے علاوہ رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں پر مبنی ڈرامے لکھے۔

اردو ڈرامہ نگاری میں آغا حشر کاشمیری روایتی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے مثلاً اسیر حوض، ترکی حور، خوبصورت بلا، سفید خون، رستم وسہراب، دل کی پیاس وغیرہ لکھی۔ اب تک اردو میں المیہ ڈرامے نہیں لکھے گئے تھے۔ آغا حشر نے رستم سہراب کی داستان پر مبنی المیہ ڈرامہ لکھا۔ ان کے ڈرامے کے نثر و نظم کے فقرے اور اشعار میں بے حد خطیبانہ قوت تھی۔ یہ خطابت جہاں حشر کے ڈرامے کی خوبی تھی وہیں کمزوری بھی تھی۔ فن کی ادبیت اردو زبان کی چاشنی اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن شعر کو ایکشن پر ترجیح دینا ڈرامہ نگاری کے خلاف ہے۔

اسی دور میں بعض غیر ملکی زبان کے ڈرامے اردو زبان میں ترجمے کئے گئے۔ ان مترجموں میں شوق قدر رائی مظفر علی خاں، بفضل حسین نصیر جوالا پرساد منشی، نور الٰہی وغیر نام قابل ذکر ہیں۔

غیر ملکی ڈرامے کے ترجموں سے نہ صرف یہ کہ اہل اردو کو غیر ملکی ڈراموں سے واقفیت ہوئی بلکہ اردو ڈرامہ نگاروں کو سیکھنے اور اپنے ڈراموں کا معیار بلند کرنے کا موقع ملا۔ خالص تفریح سے قطع نظر اس دور میں بعض ایسے ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں جن کے پیچھے سیاسی اور سماجی محرکات تھے۔ معاشرتی ڈراموں کے

Scanned with CamScanner

ذیل میں عبدالحلیم شرر کا ''میوہ''، مولانا عبدالماجد دریابادی کا ''زود پشیماں'' اور برجموہن دتاتریہ کیفی کا راج دلاری وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان ڈراموں کی حیثیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔

آغا حشر کے بعد اردو ڈرامے کا بازار سرد پڑ گیا، جسے امتیاز علی تاج نے زندہ کیا۔ امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ''انارکلی'' اردو ادب کا بہت اچھا ڈرامہ ہے۔ ادبی حلقوں میں اسے کافی سراہا گیا۔ انجام کے اعتبار سے اس میں ایک اچھے ڈرامے کی جملہ خصوصیات، کش مکش، گلائمکس، عمدہ مکالمے، ماحول آفرینی، عمل، مقام اور زبان کی وحدتیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ تاج ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن انارکلی شاہکار ہے۔

اسکے بعد اُپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سرمد عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، حکیم شجاع احمد، راجندر سنگھ بیدی، فضل الرحمٰن، محمد محسن، حبیب تنویر، مرزا دیب، شکیل الرحمٰن، انور عنایت اللہ، قدسیہ زید، کرتار سنگھ دگل وغیرہ ادیبوں کی ایک پوری فہرست ہے۔ جنہوں نے اردو ڈرامے کو نہ صرف ریڈیو کے لئے لکھا۔ ریڈیو کی تکنیک سے مختلف ہے۔ لیکن ان ڈراموں کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کا ڈرامہ ''داراشکوہ'' اور کرشن چندر کا ڈرامہ ''دروازہ کھول دو'' اردو مقصدیت کے اعتبار سے اردو ڈرامے کی عصری تقاضوں اور سماجی ضرورتوں کے تابع ہونے کا بین ثبوت ہے۔

Scanned with CamScanner

امراؤ جان ادا

(ناول)

مرزا ہادی رسوا

سوال ۱: ''ناول امراؤ جان ادا'' کی ایک اجمالی تلخیص تحریر کیجئے۔

یا ''امراؤ جان ادا'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: ناول امراؤ جان ادا کا آغاز فیض آباد کے ایک محلّہ کے منظر سے ہوتا ہے۔ جہاں امرا جان کا مکان تھا۔ جو اس زمانہ میں امیرن تھی۔ امیرن کے والد بھو بیگم کے مقبرے میں جمعدار تھے۔ امیرن کا خاندان صرف چار نفوس پر مشتمل تھا۔ اس کے والدین اور دو بھائی بہن۔ اپنے کبوتروں کو دانا کھلانا اور دونوں بچوں کی فرمائش پوری کرنا امیرن کے والد کا محبوب مشغلہ تھا۔ درحقیقت وہ مزاجاً نیک اور شریف انسان تھے۔ چنانچہ ان کے محلّہ کے ایک نامی بدمعاش دلاور خاں کے بارے میں تحقیقات شروع ہوئی تو جمعدار صاحب کو بھی گواہی دینے کے لئے بلایا گیا انہوں نے سچائی اور سادگی کے ساتھ اس کے متعلق حقیقت بیان کردی۔ ان کی گواہی پر دلاور خاں کو قید کا حکم سنایا گیا۔ بارہ سال کے بعد اسے رہائی ملی تو امیرن کے باپ سے انتقام لینے کی فکر ہوئی اور اس کا موقع اسے جلد ہاتھ آ گیا۔

ایک دن اس نے امیرن کے باپ کا کبوتر پکڑ لیا۔ جمعدار صاحب مانگنے گئے تو اس نے انہیں واپس کرنے سے انکار کردیا۔ چند روز بعد ایک شام املی کے پیڑ تلے کھیلتے ہوئے امیرن پر دلاور خاں کی نظر پڑ گئی۔ اس نے امیرن کو ورغلایا کہ تمہارے باپ تجھے پیسے دے گئے ہیں۔ تم اپنا کبوتر مجھ سے واپس لے لو۔ امیرن اس کی سازش کا شکار ہوگئی۔ دلاور خاں کے ہمراہ وہ اس کے گھر پہنچی تو وہاں اسے کوئی چڑیا بھی نظر نہ آئی۔ پھر اسے حقیقت سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ دلاور خاں نے دروازہ بند کر کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اپنے ایک دوست پیر بخش کے مشورے سے دلاور خاں نے فیصلہ کیا کہ امیرن کو قتل کرنے کے بجائے لکھنؤ میں فروخت کر دیا جائے چنانچہ امیرن کو بیل گاڑی پر سوار کر کے وہ دونوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

امیرن کی زندگی کا یہ اہم ترین موڑ ہے۔ یہاں سے کہانی ایک نئی سرحد میں داخل ہوتی ہے۔ اب فیض آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے کی بجائے کہانی کے منظر پر لکھنؤ کا چوک اپنی سسرال میں اتارا گیا جہاں اس کا سالا کریم لڑکیوں کا خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ وہاں امیرن کو ایک اندھیری کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ دو دن قید تنہائی کے بعد تیسرے دن ایک اور کمسن لڑکی رام دی کو بھی اسی کمرے میں لایا گیا۔ سپتالو کے کسی گاؤں سے اسے کریم اٹھا لایا تھا۔ چوتھے دن امیرن کو لے کر دلاور خاں چوک کے مشہور نائکہ خانم کے یہاں پہنچا جہاں سوا سو روپے میں اس کا سودا ہو گیا۔ خانم نے اس کا نیا نام امراؤ جان تجویز کیا اور اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بوا حسینی کے سپرد کر دی۔ بوا حسینی نے اردو کی تعلیم خانم کی نگرانی میں ہوتی رہی۔ امراؤ کی طبیعت موسیقی، ادب اور شاعری کے لئے بہت موزوں تھی۔ چنانچہ بہت کم مدت میں اس نے تمام فنون پر مہارت حاصل کر لی۔ شعر کہنا شروع کیا تو تخلص ''ادا'' پسند آیا۔ اس تخلص کے تحت ایک معنی خیز مقطع ملاحظہ فرمائیں ؎

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

کچھ دنوں کے بعد بوا حسینی کے توسط سے ایک لڑکے گوہر مرزا کا اسی مکتب میں داخلہ ہو گیا۔ جو آگے چل کر امراؤ کا گلچین اور بنا۔ خانم کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو فطری طور پر اسے غصہ آیا لیکن ہوش سے کام لیتے ہوئے اس نے اس معاملہ کو دبا دیا۔ تاہم جلد امراؤ کی مستی اتروانے کی فکر لاحق ہوئی اور بالآخر پانچ ہزار روپیہ پر جناب راشد علی پھنس ہی گئے۔ یہ ستم گذر گئی تو امراؤ سے امراؤ جان ہو گئی۔

خانم کے چکلے میں یوں تو کئی رنڈیاں تھیں تاہم اس میں سرفہرست خانم کی بیٹی بسم اللہ جان تھی۔ اس کے علاوہ امیر جان، خورشید جان وغیرہ جیسی طوائفوں کی بدولت خانم کے یہاں لکھنؤ کے رؤسا اور نوابوں کی ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی مرد امراؤ جان کی زندگی میں داخل ہوئے۔ مثلاً نواب سلطان وغیرہ تاہم امراؤ جان کی کہانی خانم کے مکان سے آگے نہ بڑھی اگر فیض علی اس کی زندگی میں نہ ہوتا۔ فیض علی دراصل ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن بظاہر اس کے بے پناہ خلوص سے متاثر ہو کر امراؤ جان اس کے ساتھ روانہ ہو جاتی ہے۔ راستے میں دھیان کے آدمیوں سے مقابلہ ہوتا ہے جس

Scanned with CamScanner

میں فیض علی کے آدمیوں کی شکست ہو جاتی ہے اور فیض علی بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کے گروہ کے کچھ لوگ گرفتار ہوئے اور گرفتار ہونے والوں میں امراؤ جان بھی شامل تھی۔ راجہ کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ خورشید جان ان ہی کے گھر براجمان ہے، جسے ایک میلے سے راجہ نے آدمیوں کے ذریعہ اٹھوالیا تھا

راجہ دھیان سنگھ سے پروانہ رہائی ملنے کے بعد امراؤ جان اناؤ کے لئے روانہ ہوئی۔ وہاں اچانک فیض علی سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے اور امراؤ جان ایک بار پھر تنہا نظر آتی ہے اور وہاں مولوی صاحب کے توسط سے ایک کمرہ کرایا پر لے کر امراؤ جان نے اپنی دکان کھول دی اور ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ کانپور کے گلی کوچوں میں امراؤ جان کی سریلی آواز اور اس کے پائلوں کی جھنکار گونج رہے تھے۔ امراؤ جان کا شہرہ سن کر کانپور کی ایک بیگم صاحبہ نے اسے بلا بھیجا۔ امراؤ جان ان کی دعوت پر وہاں مجرا کرتے پہنچی تو دونوں ایک دوسرے کی صورت میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی یہ بیگم صاحبہ دراصل رام دئی تھیں۔ جنہوں نے امیرن کے ساتھ کریم کی اندھیری کوٹھری میں ایک بے بسی کی رات بسر کی تھی۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اسے اپنے بیمار بیٹے کے لئے خرید لیا تھا۔ بعد میں اس بیٹے نے رام دئی کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا بہترین نمونہ پیش کیا اور اسے مسند عزت پر بیٹھایا۔

کچھ دن بعد لکھنؤ سے بوا حسینی اور گوہر مرزا وہاں پہنچتے ہیں اور امراؤ جان سے چلنے کی درخواست کرتے ہیں۔

امراؤ جان ان دونوں کی درخواست کو رد نہ کر سکی اور پھر وہی آب و دانہ وہی مکان وہی کمرہ وہی آدمی ہیں ۔

دشت جنون کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

لکھنؤ میں غدر کے وقت امراؤ جان مرزا برجیس قدر کے دور دولت وابستہ تھی، چنانچہ اس زمانہ میں مرزا برجیس قدر کی گیارہویں سالگرہ کے موقع پر اس نے ایک خوبصورت ہی غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ۔

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

Scanned with CamScanner

بالآخر لکھنؤ سے مرزا برجیس قدر کے اخراج کا سانحہ پیش آیا۔ امراؤ جان نے بونڈری تک اس کا ساتھ دیا۔ جہاں انگریزی فوج کے ساتھ مقابلہ میں برجیس قدر کے فوجی افسر سید قطب الدین مارے گئے اور پھر برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے اور امراؤ جان نے فیض آباد کی راہ لی جہاں سے اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی۔

چھ ماہ کے قیام کے دوران اس نے وہاں کافی شہرت حاصل کی۔ ایک روز بہو بیگم مقبرے سے کوئی شخص اس سے ملنے آیا۔ گفتگو کے بعد اس سے پتہ چلا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کی جگہ پر اس کا چھوٹا بھائی ملازمت کرتا ہے۔ امراؤ جان کے دل میں اپنے بھائی اور ماں سے ملنے کی شدید خواہش ہوتی مگر وہ اس خواہش کا گلا گھونٹنے پر مجبور تھی، کہ اس کے خاندان کی رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔

اسی زمانے میں ایک مجرا آیا اور قسمت کی خوبی دیکھئے کہ یہ مجرا املی کے اسی درخت کے نیچے ہو رہا تھا جہاں امیرن کھیلا کرتی تھی۔ اور جہاں سے وہ گرفتار ہو کر خانم کے گھر پہونچی تھی۔ بارہ بجے رات تک مجرا چلا۔ مجرا کے بعد اس کی ماں نے بلایا اور اس کے کان کے پاس بچپن کی نشانی دیکھ کر "ہائے میری امیرن" کہہ کر اس سے لپٹ گئیں۔ رات بھر بیٹی اپنی ماں کو دکھ بھری داستان سناتی رہی۔ اور ماں کے بہتے ہوئے آنسو کی بے بسی پر خاموش فریاد کرتے رہے۔

صبح امراؤ جان اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا چھوٹا بھائی وہاں پہنچتا ہے اور اس تنگ خاندان بہن کے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر پھر خون کی محبت رنگ لاتی ہے اور وہ رونے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔

دوسرے دن امراؤ جان لکھنؤ میں کرائے کے ایک کمرے کو ترجیح دی۔ یہاں نواب محمود صاحب سے امراؤ جان کی رسم و راہ بڑھی۔ بالآخر نواب صاحب نے اسے پابند کرنا چاہا مگر یہ آزاد پنچھی بھلا قید کو کس طرح گوارہ کرتی۔ چنانچہ یہ قضیہ عدالت پہونچا۔ جہاں نواب صاحب نے یہ دعویٰ دائر کیا کہ امراؤ جان اس کی منکوحہ زوجہ ہے لیکن عدالت عالیہ میں ان کا دعویٰ بالکل باطل قرار دیا گیا۔ اس قضیہ سے امراؤ جان کو نجات ملی تو وہ درگاہ کی زیارت کو چلی۔ وہاں کانپور والی بیگم رام دئی سے اس کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بھی اب لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے امراؤ جان کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ امراؤ جان وہاں پہنچی تو یہ راز کھلا کہ ان کے شوہر وہی نواب سلطان ہیں جن کی منظور

Scanned with CamScanner

نظر کسی زمانہ میں امراؤ جان رہ چکی تھی۔ برسات کی ایک شام میں بخشی کے ایک تالاب پر پکنک کا پروگرام بنتا ہے۔ امراؤ جان دوسری رنڈیوں اور آشناؤں کے ساتھ روانہ ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی فراغت کے بعد امراؤ جان ٹہلتے ہوئے تنہا دور تک نکل گئی۔ واپسی پر دور سے ایک شخص کو اس نے زمین کھودتے ہوئے پایا۔ غور سے دیکھا تو یقین ہو گیا کہ یہ دلاور خاں کے علاوہ اور کوئی نہیں جس کی ذات امیرن کو امراؤ جان بنانے کا باعث بنی تھی۔ امراؤ جان نے واپس آ کر اپنے ساتھیوں کو اس کی اطلاع دی۔ ان لوگوں نے فوراً تھانہ میں خبر کی۔ تھانہ دار چند پولیس والوں کے ساتھ آیا اور کافی تگ دو کے بعد دلاور خان کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد ازاں اسے پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ ناول کے آخر میں امراؤ جان اپنی تمام زندگی کے تجربات و مشاہدات کا ماحصل بیان کرتی ہے اور اس پر ناول ختم ہوتا ہے۔

سوال ۲: ناول نگاروں کی صنف میں مرزا ہادی رسوا کا کیا مقام ہے؟

یا ''امراؤ جان ادا'' کی روشنی میں مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کا جائزہ لیجئے۔

جواب: مرزا ہادی رسوا کو ریاضی اور فلسفہ سے دلی لگاؤ تھا۔ ان علوم کے اثر سے ان کا ذہن مرتب ہو گیا تھا۔ حقیقت بینی اور استدلال ان کے انداز فکر کا جزو بن گئے تھے۔ اسی انداز فکر سے ناول نگاری میں انہیں بڑی مدد ملی۔ کسی نے کہا ہے کہ پلاٹ کی تنظیم ایک فلسفیانہ عمل ہے اور ناول نگاروں میں اس قول کا مصداق مرزا سے زیادہ کوئی نہیں ان کی بہترین ناول ''امراؤ جان ادا'' اور ان کے بدترین ناول ''شریف زادہ'' میں ایک ہی معیار کی نظر آتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پلاٹ کی تنظیم پر کس قدر توجہ دیتے تھے۔ امراؤ جان ادا سے جو تاثر قائم کرنا چاہتے تھے۔ شروع ہی سے اس کا خیال رکھا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں پائی جاتی ہو جو اس وحدت اثر کو ضعف پہنچاتے۔ ان میں ہر چیز ریاضی کے فارمولے پر تپی تلی ہے۔

پلاٹ :- فنی طور پر اس ناول کے تانے بانے بڑے مستحکم اور مضبوط طور پر بنے گئے ہیں۔ بالخصوص اس پلاٹ کی تعمیر میں رسوا نے بڑی محنت اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اور ادب کے طالب علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ جس ناول میں کوئی کردار اپنی سرگذشت پیش کرتا ہے، اس میں فطری پلاٹ کی تعمیر نسبتاً دشوار ہوتی ہے۔ لیکن مرزا نے اسے منطقی ترتیب دے کر اس میں ایک فطری پن پیدا کرنے کی

Scanned with CamScanner

کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں ایک ایسی طوائف کی سرگذشت پیش کی گئی ہے، جس کے مزاج اور ذوق سے ہم شروع میں ہی آشنا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اردو شاعری سے بے پناہ لگاؤ رکھتی ہے اور اچھا شعر اسے متاثر بھی کرتا ہے۔ وہ نفاست پسند بھی ہے اور نازک خیال بھی۔

ناول کی ابتدا ہی میں امراؤ جان کے اغوا کا واقعہ اور پھر خانم کی دنیا میں پہنچنا اس کے بعد وہاں سے واقعات کا فطری بہاؤ ایک منظر اور مرتب پلاٹ کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ چونکہ قصے کے اجزاء تمام سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مرزا رسوا نے جہاں کہیں پلاٹ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے اس کے لئے بطور خاص معروضی داخلی اسباب پیدا کیا ہے تاکہ اس پر غیر فطری ہونے کا الزام نہ رہے۔ چنانچہ نواب چھبن کی خودکشی کے بعد ان کا کردار ناول کے منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ تاہم آخر میں انہیں ایک بار پھر منظر پر لانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی گنجائش امراؤ جان کے ساتھ اپنی درج ذیل گفتگو میں اس طرح نکالی۔

رسوا: اس لئے کہ مجھے میر پچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصیدے میں نہیں ڈوب سکتا ہے۔

امراؤ جان: کیا معلوم! یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔

رسوا: نواب صاحب تیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

اسی طرح فیض علی کے ساتھ امراؤ جان کے بھاگنے کے واقعہ کے لئے بھی فضا ہموار کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ عیش باغ کے میلے سے قاری خورشید کے اغوا کا بھی واقعہ غیر فطری معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے لئے بہت پہلے سے قاری کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض چھوٹے بڑے تمام واقعات کو منطقی ربط اور معروضی تسلسل دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً گوہر مرزا کے کردار کو لیجئے۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک دلچسپ اور زندہ دل کردار ہے، مرزا رسوا سے قاری کے سامنے بہت دیر تک نہیں رکھنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے اس کی چنڈو پینے کی عادت کو سہارا بنایا ہے اور اس طرح پلاٹ میں فطری پن پیدا ہو گیا ہے۔

آگے چل کر قصہ میں امراؤ جان کو لکھنؤ سے نکال کر گڑھی میں خورشید سے ملوانا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے فیض علی کا کردار تراشا گیا، جو اسے کانپور لے جانے کا سبب بنتا ہے۔ یہ سارے واقعات پلاٹ میں ہم آہنگی اور تسلسل برقرار رکھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

امراؤ جان کے پلاٹ پر گفتگو خود مرزا کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ناول کا یہ کردار دلچسپ اور ناقابل فراموش ہے۔ یہ کردار پلاٹ کے حسن تعمیر میں بڑا معاون ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کو جس مقام پر فٹ کرنا چاہا ہے، امراؤ جان سے دریافت کر کے وہاں بیان کیا ہے اور اس طرح اس کردار نے قصہ میں جھول پیدا کرنے کی گنجائش ختم کر دی ہے۔ اس اعتبار سے مرزا رسوا کا یہ ناول ایک ایسا شعر ہے جس کا ایک بھی لفظ اس کے خاص مقام سے ہٹانے پر سارا شعر درہم برہم ہو جاتا ہے۔

غرض امراؤ جان ادا کا پلاٹ ایک ایسا محراب ہے جس کے ایک سرے پر مشاعرہ ہے اور دوسرے سرے پر امراؤ جان کا فلسفہ حیات جو انہوں نے اپنے خط میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ ناقدین اس مشاعرہ اور خط کو پلاٹ تسلیم کرنے میں تامل نظر آتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دونوں چیزیں پلاٹ کے افتاحیہ اور اختتامیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشاعرہ سے ناول مرکزی کردار امراؤ جان کی حیثیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اور آخر میں اس لفظ کا ناول کا گویا نچوڑ ہے۔ بالخصوص خط کے آخر میں امراؤ جان کا یہ جملہ کے سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک منھ دیکھ کر دوسرے کا منھ کبھی نہیں دیکھتی۔ ناول کے خاکے میں حقیقت کا رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔ یہ خط پلاٹ کی تکمیل کا باعث بھی ہے۔ یہ مرکزی کردار کے علاوہ ذیلی کردار بھی ہیں جو قصے کو کامیاب طرز سے آگے بڑھاتے ہیں۔ بسم اللہ، خورشید، رام دئی کے قصے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کردار نگاری :- کردار نگاری میں مرزا رسوا کے قلم نے جادوگری کا کمال دکھایا ہے۔ امراؤ جان ادا کے کردار صناعی اور فنکاروں کا معجزہ ہے۔ امراؤ جان کے علاوہ ناول میں بہت سے کردار ہیں۔ کچھ دور تک پھیلے ہوئے کچھ پل بھر کو نظر آ کے آنکھ سے اوجھل ہو جانے والے، مگر دونوں لازوال اور حافظے سے نہ مٹنے والے فیض علی ڈاکو کے ساتھ فضل علی جو نواب سلطان کے گھر ڈاکہ ڈالنے آتے ہیں، لیکن اپنے دوست کی آشنا کو یہاں پا کے لوٹ مار کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔ وہ ذرا دیر کو نمودار ہوتے ہیں۔ مگر دائمی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم بھی تیرے ساتھ، کا مختصر جملہ ادا کر کے ساتھیں بھی انفرادیت کا سکہ جما دیتا ہے۔ نواب سلطان کا جاں نثار ملازم ایک ایک پل کو نظر آتا ہے۔ مگر ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

یہ مرکزی فنکاری کمال ہے کہ ہر کردار اپنی جماعت کا نمائندہ ہونے کے باوجود انفرادیت کا مالک ہے۔ امراؤ جان خورشید، بسم اللہ سب طوائفیں ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل الگ۔

Scanned with CamScanner

امیرن جب پہلی بار خریداری کے لیے خانم کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔ کنول روشن ہے، بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی لڑکی ناچ رہی ہے۔ یہ سانولی سی لڑکی خانم کی بیٹی بسم اللہ تھی۔ طوائف اور طوائف زادی یہ بڑی ہو کر آفت کی پرکالہ نکلی۔ بہت مکار، لالچی اور زبان دراز، ضد کی پکی تھی اور کسی کی پروا نہ کرتی تھی۔ حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے ماں کو بھی تکلیفیں پہنچیں اور وہ اس صورت سے بیزار ہو گئیں۔

خورشید جان اچھی صورت کی آواز نہ تھی۔ مگر ناچتی خوب تھی۔ مزاج کی نیک، دل کی اچھی مگر تقدیر کی ہیٹی تھی۔ حسن خداداد تھا چہرے سے شرافت برستی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ رنڈی پنے کے لائق نہ تھی۔ وہ جسے چاہتی تھی ٹوٹ کے چاہتی تھی۔ کسی کی بیوی ہوتی تو وفادار ہوتی اور خوب نباہ کرتی۔ دس کی ہو کر جینا اسے پسند نہ تھا۔ پیارے صاحب کو ان سے عشق تھا۔ اُن کی جائداد ضبط ہو گئی۔ اور وہ محتاج ہو گئے۔ تو ان کا اصرار تھا کہ مجھے گھر میں ڈال دو پیارے صاحب کی شادی کہیں اور ہونے لگی۔ وہ مانجھے کا جوڑا پہن کر آئے۔ پہلے تو چپ بیٹھیں پھر گال سرخ ہو گئے۔ جوڑے ٹکرے ٹکرے کر ڈالے۔ پھر روتی رہیں۔ بخار آنے لگا۔ ایک دن راجہ دھیان سنگھ نے میلے سے انہیں اٹھا لیا۔ یہ اس کے گھر خوش تھیں کہ اب کسی ایک کی تو ہو کے رہنا ہے۔

فیض علی کا کردار بھی بہت جاندار ہے، وہ ڈاکو ہے، خوب لوٹتا ہے، خوب لٹاتا ہے۔ دلیر ہے، بات کا پکا ہے۔ نواب سلطان کا کردار بھی ناول نگار کا شاندار کارنامہ ہے۔ ناول میں مولویوں کے کئی کردار ہیں اور سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ سب سے دلچسپ کردار مولوی صاحب کا ہے جو بسم اللہ پر عاشق ہیں۔ اور اس کی بندریا وہ دانت کراگلے دن سزا پاتے ہیں۔ مقدس صورت، نورانی چہرہ عربی کے عالم، سفید داڑھی، ستر برس کی عمر، ایک ہاتھ میں عصائے مبارک اور دسرے میں زیتوں کی تسبیح، ہونٹوں پر یا حفیظ کا ورد۔ مگر ایک رنڈی بسم اللہ پر عاشق ہیں۔ اس نے حکم دیا نیم پر چڑھ جاؤ۔ ان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، تھر تھر کانپنے لگے۔ کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو اتنے میں پھر نادر شاہی حکم ہوا، کہتی ہوں، چڑھ جاؤ۔ انہوں نے عبائے شریف اتاری، پائنچے چڑھائے اور نیم کی تک پہنچ گئے۔

مصنف نے مولویوں کے کرداروں سے طنز وظرافت کا کام بھی لیا ہے۔ ناول کا سب سے زبردست اور شروع سے آخر تک چھایا ہوا کردار امراؤ جان کا ہے۔ کردار نگاری کے معاملے میں اس

Scanned with CamScanner

ناول کا جواب مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔

مکالمہ نگاری :- زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے مرزا رسوا ایک مسلم الثبوت استاذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے سرشار نے لکھنوی زبان کے اچھے نمونے پیش کئے تھے۔ تاہم ان کی نگاہ سطح تک محدود رہی۔ وہ اوپر کی ساکن سطح کے نیچے سے لہریں لیتی ہوئی موجوں کو نہ دیکھ سکے۔ خالص طور پر کردار کی نفسیاتی تصویر کشی کی جو طرز مرزا رسوا نے ایجاد کی، اس سے ان کے دو بڑے پیش رو سرشار اور شرر محروم نظر آتے ہیں۔ چوں کہ ''امراؤ جان ادا'' ایک طوائف کی کہانی ہے۔ اس لئے بقول عباس حسینی اس کا موضوع خطرناک ہے۔ تاہم مرزا رسوا نے اپنی مخصوص زبان و بیان کے ذریعے اس میں ایک پاکیزہ اور لطیف رنگ بھرنے کی سعی کی ہے اور اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کی زبان غیر مصنوعی اور فطری ہے۔ جیسی زبان عام طور پر بول چال کے موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :-

''زبان وہی روزمرہ کی ستھری، نکھری اور بول چال کی جو ہم اور آپ بولتے ہیں''

فراق گورکھپوری نے جب امراؤ جان ادا کو ہندی کا جامع پہنایا تو اس کی زبان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ انہوں نے رسوا کی زبان کو ناول کی رخ قرار دیا ہے۔ چونکہ وہ لکھنؤ کے ہر پیشہ اور طبقہ کے لوگوں سے واقف تھے۔ اس لئے اس مقام و مرتبہ کے مطابق اس کی زبان سے مکالمے ادا کرتے ہیں۔ مثلاً خانم کی یہ گفتگو دیکھئے جو وہ ایک دیوالیہ نواب چھین سے کرتی ہے۔ اوی نواب سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب کچھ تو ارشاد کیجئے۔ سکونت سے بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ وہاں نہ سہی، کچھ تو ارشاد کیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔

مرزا رسوا نے اپنے مکالمہ میں مخصوص فلسفیانہ نظریات کو بھی بیان کیا ہے۔ بالخصوص وہ اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت سے کہیں بھی باز نہیں رہے۔ مثلاً یہ کہ طوائف خواہ کتنی تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں اپنا مقام بنالے اس کے باوجود ایک معمولی سی عورت سے فروتر رہے گی۔ یہ مرزا کا فلسفیانہ اخلاق ہے کہ دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔ عورت اور مرد کی محبت پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا رسوا اپنا فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ مرد کی محبت میں الم محفوظ رہتا اور لذت دونوں فریقین شاداں ہیں۔ فلسفہ اخلاق

Scanned with CamScanner

کے سنجیدہ موضوع کے ساتھ ناول میں ظرافت کی چاشنی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ دو ظریف کردار مولوی صاحبان کے ہیں جن کا ذکر قبل ہو چکا ہے۔ مرزا رسوا نے اپنے مکالموں اور زبان و بیان سے بھی ظرافت کا رنگ پیدا کیا ہے۔ مثلاً عیش باغ کے میلے میں ایک صاحب کی شخصیت ملاحظہ فرمائیں :-

''ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی تکدر، چیں بہ جبیں، کچھ چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں۔ معلوم پڑتا ہے بیوی سے لڑ کے آئے ہیں۔ جن کے باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے۔ انہیں اب یاد کرتے ہیں۔''

مرزا رسوا کی مکالمہ نگاری فطری نگاری اور حقیقی بھی ہے۔ کہیں بھی کوئی جھول نظر نہیں آتا ہے یا تصنع کی کیفیت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مثلاً ایک بیگم اور بڑھیا کا یہ دلچسپ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں :-

بڑھیا :- مجھ نگور ساری نے اتنا تو پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ بھلا کیا گناہ کیا۔

بیوی :- تم کہتی یقین میں جانتی ہوں، پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا :- کیا مطلب تھا، اچھا، مطلب بتادوں گی تو سہی۔ اپنا عوض نہ لوں گی۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم :- چل شفنل، تو کیا بدلے لیگی۔ ذرا کسی بھلاوے پر نہ بھولنا۔

بڑھیا :- کیا مطلب تھا، اچھا، مطلب بتادوں گی تو سہی۔ اپنا عوض نہ لوں گی۔

بیگم :- تیرے دل والے کی ایسی تیسی، نکل یہاں سے۔

بڑھیا :- لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں (یہ کہہ کر بڑھیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لہٰذا جھاڑ جھوڑ (بڑبڑاتی ہوئی) بڑی نکالنے والی، جاتے ہیں۔ دیکھیں تو کیوں نہیں آنے دیتیں۔

منظر نگاری :- کسی بھی ناول کی کامیابی میں منظر نگاری کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول میں ایسی حقیقی منظر نگاری کی ہے، جو ان زندگی کا ضامن بن گئی ہے۔ انہوں نے اندرونی اور بیرونی قسم کے مناظر کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ ناول کے آغاز میں ایک مشاعرے کا آغاز دکھایا گیا ہے جس میں اودھ کی معاشرت کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ اجلی چاندنی کا فرش کوری صراحیوں میں ٹھنڈا پانی اور پھر اس میں کیوڑے کی آمیزش پالوی کی گلوریاں حقوں میں خوشبودار تمباکو وغیرہ یہ تمام

Scanned with CamScanner

چیزیں اودھ کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اسی طرح عیش باغ کے منظر کشی میں بھی وہ تمام لوازمات کو بروئے کار لائے ہیں۔ جن کی ایک میلے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اندرونی مناظر میں بھی اللہ کے کرب کا منظر بھی خوب ہے۔ نواڑ کے پلنگ، صاف چاندنی، بڑے بڑے نقشی پاندان، چھپر میں جھاڑ اور پھر دو روشن کنول، یہ ایک جوان شوخ رنڈی کا کمرہ ہے اور اس کے بالمقابل بوا حسینی کے کمرے کا منظر دیکھئے۔

بوا حسینی کی کوٹھری جس کے در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی۔ اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف کوٹھری میں چولہا بنا ہوا تھا۔ چولہے کے اوپر دیوار میں کیلیں لگی ہوئی تھی۔ کھانے پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔

غرض وہ باہر کا منظر ہو یا اندر کا، مرزا رسوا نے ہر جگہ فطریت برقرار رکھی ہے جو ان کے فنی محاسن کی دلیل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "امراؤ جان ادا" میں فنی اعتبار سے کوئی پہلو تشنہ نہیں ہے۔ پلاٹ کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کی مکمل ہم آہنگی ناول کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مرزا رسوا نے اس کے اصلاح کا کام بھی لیا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کی کہانی کے ساتھ اس کے اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، تا کہ آئندہ اس سے بچا جا سکے۔ بعض جگہ ان پر مقصد کا اس قدر غلبہ نظر آتا ہے کہ فن کار رسوا پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ ان تمام اسباب و خصوصیات کی بدولت نور الحسن نقوی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "امراؤ جان ادا" ہماری زبان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

❁❁❁

Scanned with CamScanner

مضامین پطرس

(انشائیہ)

سوال ۱: ''پطرس بخاری کا کمال یہ کہ وہ خود ہی ہنستے ہیں۔ اس خیال کی تائید کرتے ہوئے پطرس کی ظرافت نگاری پر ایک مقالہ لکھیے۔

جواب: پطرس بخاری ایک باکمال انشائیہ نگار ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے آل احمد سرور فرماتے ہیں :-

> ''پطرس بخاری بجا طور پر ایک زندہ دل فنکار ہیں۔ ان کا آرٹ الفاظ میں نہیں بلکہ واقعات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔''

علی عباس حسینی نے پطرس بخاری کے مشہور آرٹ کتے پر تبصرہ کرتے ہیوئے لکھا ہے کہ:-

> ''پطرس کا کتاب نایاب اور اچھوتا ہے۔ انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ مزاح نگار رہزن کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔ اور بالعموم نفسیاتی لحاظ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ کتوں کی طرح انسان بھی پٹنا تو پسند کر لیتے ہیں لیکن یہ گوارہ نہیں کرتے کہ ان کے اوپر کوئی ہنسے۔ لیکن پطرس ایسی ہنسی کو پسند کرتے ہیں۔''

پطرس نے بڑی دوراندیشی اور چالاکی کے ساتھ بعنوان کتے کی شکل میں طنز و مزاح کے اصول اور اس کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے۔

پطرس کی ظرافت نگاری پر ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں کہ:-

> ''پطرس کی ظرافت نگاروں میں نفسیاتی پہلو کا اظہار ملتا ہے۔ مشا بہت مزاج کی وجہ کر شاعروں اور کتوں کے ہنگاموں کے مابین ایک تحریک ملتی ہے۔''

پطرس کا کمال ہے کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس میں اپنے فن کی بلندی اور سچائی کا

Scanned with CamScanner

ثبوت پیش کر دیتے ہیں۔ ہم پطرس کے مضامین پڑھتے وقت قدم قدم پر ان کے مشاہدے کی وسعت سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ان کے طنز و ظرافت کی زیریں لہر کو بھی محسوس کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مضامین میں ایک لہر سرایت کر گئی ہے اور ہمہ وقت متحرک ہے۔

پطرس کی ظرافت نگاری میں ہلی پھلکی زبان میں مزاح ملتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو نہ تو پلاٹ کی بھول بھلیوں میں بھٹکاتے ہیں اور نہ ہی اجنبی کرداروں میں گم کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی حقیقت نگاری اپنے وقت کی رومانیت کے خلاف ایک شدید ردعمل معلوم ہوتی ہے۔ ان کے غیر معمولی مشاہدے، فکر اور سمجھ بوجھ ان کے مضامین میں فنی خوبی کو نکھارتے ہیں۔ ان کی ذہنی پختہ کاری کی وجہ کر ان کی شخصیت بحیثیت فنکار شوکت علی تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی سے بہتر ہے کیوں کہ ان کے فن میں تخیل اور طباعی کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ پطرس بیگ اس وقت کے اچھے طنز نگار اور مزاح نگار دونوں دکھائی دیتے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ طنز و مزاح کا رشتہ چولی دامن کا ہوتا ہے۔ یہ قول بھی درست ہے کہ ظرافت ایک ذہنی کیفیت ہے اور طنز ایک عملی اظہار کا نام ہے۔ جہاں تک طنز نگار کی حیثیت سے پطرس بخاری کے کارناموں کا تعلق ہے۔ ان کی گوناگوں اہمیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اصناف نثر میں طنز کے نقطۂ نظر سے انشائیہ کو اولیت حاصل ہے اور اسی لحاظ سے پطرس کا مقام بھی کافی بلند نظر آتا ہے۔ انہوں نے اسی صنف میں طنز نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ ایک طنز نگار اور کارٹونسٹ میں یہ بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ زندگی کے بے تکے پن کو اجاگر کرنے کے لئے کسی چھوٹی سی چیز کو غیر معمولی طور پر اہم اور کسی بڑی چیز کو غیر معمولی طور پر کمتر بنا کر دکھاتا ہے۔ اس کی مثال پطرس بخاری کے مضمون کتے میں ملتی ہے۔

جہاں انہوں نے کتے کے بچے کو دو، دو تین، تین تولے کے پلے قرار دیا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ کتے کے بچے چھوٹے تو ہوتے ہیں مگر اتنے چھوٹے نہیں کہ انکا وزن صرف دو تین تولہ ہو۔ ایک طنز نگار کے انداز بیان نفاست اور اسلوب میں بداعت کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ سپاٹ طنز ادب سے خارج ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے پطرس بخاری نہایت کامیاب ہیں۔ ان کے انداز بیان میں رنگینی و رعنائی موجود ہے اور ظرافت کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ ان کی ظرافت نگاری کے اچھے نمونے ان کے مضامین میں ہم دیکھتے ہیں ان کے مضامین میں کتے، ہاسٹل میں پڑھنا اور کل سویرے جو میری آنکھ کھلی وغیرہ نہایت عمدہ ظرافت نگاری ہے۔

Scanned with CamScanner

سوال ۲: ''مرحوم کی یاد میں'' یا ''سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'' میں سے کسی ایک انشائیہ پر نگاہ ڈالئے۔

جواب: احمد شاہ پطرس بخاری فطری طور پر پُر مذاق اور زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ انکی شخصیت کے اس پس منظر میں جب ان کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ خود بخود ابھرنے والے مزاح کی برقابی سے مملو نظر آتی ہیں۔ پطرس کے مضامین سے اردو نثر میں انگریزی طرز کے خالص مزاح کی روایت شروع ہوتی ہے۔

پطرس نے صرف گیارہ مضامین لکھ کر اردو ظرافت نگاری میں جو مقام حاصل کر لیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے دوسرے ظرافت نگاروں کو تصنیف و تالیف کی نہ جانے کتنی کٹھن منزلوں سے گذرنا پڑا ہوگا۔ اس لحاظ سے پطرس کے مضامین بہت دقیع اور اردو ظرافت میں ایک نئی روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''سویرے جو کل میری انکھ کھلی''، ''مرحوم کی یاد میں'' لاہور کا جغرافیہ'' ''انجام بخیر'' اور ''کتے'' پطرس کے بہترین مضامین شمار ہوتے ہیں۔

پطرس بخاری نے انشائیہ ''سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'' کے عنوان کے تحت ایک نفسیاتی مرض کا جائزہ پیش کیا ہے۔ عموماً شہری زندگی میں لوگ دیر تک جاگنے کی وجہ کر سویرے اٹھنے کی کوشش محال ہے۔ اس طرح دیر تک سونے والے لوگ ذہنی اور جسمانی مریض ہو جاتے ہیں۔ کام کا بوجھ روزانہ بڑھتا جاتا ہے۔ نہایت ضروری کام بھی ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ بالخصوص طالب العلم کی زندگی میں جب دیر تک سونے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسے طالب العلم کی حاضری اور کلاس کے اندر ان کی دل چسپی بھی برقرار نہیں رہ پاتی ہے۔

اس پس منظر میں پطرس بخاری نے مزاحیہ انداز میں ایک ایسے کردار کا ذکر کیا ہے جو سویرے اٹھنے کا ارادہ کر کے روزانہ خواب گاہ میں بستر پر دراز ہو جایا کرتا تھا۔ اور ارادہ کرتا تھا کہ دوسرے روز نہایت سویرے اٹھ کر اپنے فرائض منصبی کو ادا کریگا۔ لیکن عادت کا مریض سویرے آنکھ کھلنے کے باوجود بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنے ایک پڑوسی کو جو بہت سویرے جاگنے کا عادی تھا، اٹھانے کی زحمت دی تھی۔ اس نے پہلے دن بہت سویرے جگا دیا۔ اس وقت تقریباً ۲ بج رہا تھا، لیکن نیند ٹوٹ جانے کے باوجود اپنے محسن کو جواب دے کر پھر بدستور بستر پر دراز ہو معمول کے مطابق ۶ بجے صبح جاگتا ہے۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جاگنے کے بعد بھی جسم کے بستر سے علیحدہ کرتے کرتے نیند کی

Scanned with CamScanner

آغوش میں چلا جاتا ہے لیکن نیند کی حالت جاگنے کا مزہ اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ حالت خواب میں
فرائض کی ادائیگی کا مزہ محسوس ہوتا ہے۔ اس انشائیہ میں پطرس بخاری نے یہ واضح کیا ہے کہ عادت
چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ انسان کو غلام بنالیتی ہے۔

عادت کو بدلنا نہایت دشوار ہے۔ نیند کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا دیر تک سونے کی
عادت تو ایسی خراب ہوتی ہے کہ اس پر قابو پانا دشوار کام ہے۔ اس انشائیہ کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ
پطرس بخاری نے نہایت خوبی کے ساتھ ہجو، طنز، ظرافت اور خوش طبعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے فن میں
لطف اٹھانے کا نام ظرافت ہے۔ ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں ہے۔ عموماً طنز کا نام مقصد تنقید
واصلاح اور ظرافت کی غرض تفریح اور مزاح ہوا کرتی ہے۔

سوال ۳: طنز اور ظرافت کا فرق واضح کرتے ہوئے پطرس کی ظرافت نگاری پر ایک مقالہ لکھئے۔

جواب: طنز کے لغوی معنی ناز، تجربہ اور رمز کی بات کہنے کے ہیں جو طعنہ جیسی بات ہوتی ہے
اصطلاح کے لحاظ سے انگریزی میں اس کو Satire کہا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی بے ہنگام
مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جو جذبات ہوتے ہیں ان کو اس طرح ادا کیا جائے کہ اس میں خوش
طبعی اور ہنسی کا پہلو ظاہر ہو۔

طنز نگاری میں حتی الوسع زندگی کے ہر شعبے پر ناقدانہ نظر شامل ہوتی ہے۔ جس میں
عموماً جذبات مرحمت ومحبت یا نفرت وحقارت کی تحریک شامل ہوتی ہے۔ طنز وظرافت کی سرحدیں یوں
بظاہر ایک دوسرے کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل طنز اور ظرافت میں ایک نہایت باریک فرق
پایا جاتا ہے۔ عربی ظرافت کے معنی عقل منداور ہوشیار ہوتا ہے۔ ظریف عقلمند کو کہتے ہیں۔ عربی کا مشہور
مقولہ ہے :- ''الملح فی الکلام کالملح فی الطعام'' یعنی کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے
میں نمک کو ہے۔ طنز کی طرح ظرافت کا محرک بھی وہ تقیض کا بے تکا پن ہوتا ہے جو شخصیت یا سماج میں
رواج پایا گیا ہو۔ اس تقیض سے اٹھانے کا نام ظرافت ہے۔ اسے ہم اس طرح بھی ادا کر سکتے ہیں کہ
ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں طنز کا مقصد تنقید واصلاح اور ظرافت کی غرض تفریح ومزاح ہوا کرتی
ہے۔ اسی لحاظ سے اصطلاح میں ظرافت اور مزاح کو ایک ہی مفہوم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

طنز وظرافت کے فرق کو سمجھاتے ہوئے علی عباس حسینی نے بڑے مزے کی بات لکھی ہے۔

Scanned with CamScanner

''ظرافت محض جلد کو چھو کر نکل جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض حصوں کے لمس سے گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ مگر نرم جلد والا بھی ایک قہقہہ کے بعد چکنا گھڑا بن جاتا ہے۔ طنز کی حالت اس نشتر کی ہے جس سے نہ صرف زخم کا ہی منہ نہیں کھولا جاتا ہے بلکہ بڑے انہماک سے اور نہایت ہوشیاری سے ٹانکا بھی دے کر سی دیا جاتا ہے۔ طنز اس کانٹے کی طرح ہوتا ہے جو ہمیشہ کھٹکتا ہے اور طنز کا تیشہ دل و دماغ سے نئی نئی نہریں کاٹ کر نکالتا ہے لیکن ظرافت میں نہ تو عمیق ہے اور نہ دیرپائی بلکہ ایک وقتی جذبہ ہوتا ہے۔

پطرس بخاری کے طنز وظرافت میں لفظوں کی شعبدہ بازی نہیں ہوتی ہے۔ وہ حقیقی تصویریں پیش فرماتے ہیں۔ وہ رمز و کنایہ کا سہارا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ نہایت ہلکی پھلکی زبان میں اپنے غیر معمولی مشاہدے اور مطالعے کو پیش فرماتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں تخیل اور طباعی دونوں نظر آتی ہے۔

بقول کلیم الدین احمد :۔

> ''ان کی ظرافت خواہ اکتسابی ہو لیکن ان کی ذہنیت نسبتاً پختہ ہے اور ان کی شخصیت کی گہرائی شوکت علی تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی سے زیادہ اہم ہے وہ تخیل اور طباعی میں فرحت اللہ بیگ سے بھی بہتر ہیں۔''

پطرس بخاری کے طنز وظرافت کا کمال ہے کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس میں اپنے فن کی بلندی اور مسیحائی کا ثبوت پیش فرماتے ہیں۔

سوال ۴: **پطرس کے مظمون ''کتے'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔**

جواب: ''کتے'' عام کتابی سائز کے تقریباً چار صفحات پر پھیلا ہوا پطرس بخاری کا مشہور و معروف طنزیہ ومزاحیہ مضمون ہے جسے آل احمد سرور نے بجا طور پر ان کے زندہ رہنے والے مضامین میں شمار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا جس قدر تتبع کیا گیا ہے وہ اس کی کامیابی کا بہترین ثبوت ہے۔ پطرس کے فن پر قلم اٹھانے والے تقریباً تمام ناقدین نے ان کے اس مضمون کا تذکرہ کیا اور حوالہ دیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی کتاب طنزیات ومضحکات میں پطرس کی طنز وظرافت کو ارض پنجاب میں مرقع چغتائی کی حیثیت دیتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی تحریر نغمہ نہیں بلکہ فضا پیدا کرتی ہے اور ان کا آرٹ الفاظ میں نہیں بلکہ واقعات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ پطرس کے مضمون ''کتے'' کا طویل اقتباس پیش کیا

Scanned with CamScanner

ہے علی عباس حسینی نے ایک مقام پر بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ''پطرس کا کتا نایاب اور اچھوتا ہے۔ انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ مزاح نگار رہزن کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے اور بالعموم نفسیاتی لحاظ سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ کتوں کی طرح انسان بھی پٹنا تو پسند کر لیتے ہیں لیکن یہ گوارہ نہیں کرتے کہ ان کے اوپر کوئی ہنسے۔ چنانچہ مزاح نگاری نے انسانوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم پطرس کے اس مضمون پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں مضمون نگار کے انتخاب عنوان کی داد دینی پڑتی ہے کہ پطرس نے کتے کی شکل میں گویا طنز و مزاح کے اصول اور اس کے نفسیاتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ایک تمثیل کے طور پر نہایت دور اندیش اور چابکی کے ساتھ موضوع کا انتخاب کیا ہے اور غالباً اسی لحاظ سے پطرس کے کتے کو معنوی پیروڈی کا اچھا نمونہ قرار دیا گیا ہے کیوں کہ یہاں تمثیل کے پیرائے میں ایک خاص فلسفہ، طرز فکر اور نظام کے معنوی نقائص کو پطرس نے بے نقاب کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مضمون کے فنی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ اس میں اس مشابہت اور تضاد سے مزاح کو تحریک ملتی ہے جو شاعروں اور کتوں کے ہنگاموں کے مابین ہے۔ بقول فرقت کاکوروی واقعی پطرس نفسیات کے ماہر تھے۔ چنانچہ اس مضمون میں نہ صرف یہ کہ موضوع اور عنوان کے انتخاب کی حد تک انہوں نے طنز و مزاح اور اس کے محرکات کے نفسیاتی پہلو کو سامنے رکھا ہے۔ بلکہ مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک عام پڑھا لکھا آدمی تو واقعی اس موضوع پر قلم اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ پطرس کا کمال ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھا کر انہوں نے اپنے فن کی بلندی اور مسیحائی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ مضمون کو پڑھنا شروع کر دیں تو قدم قدم پر نہ صرف یہ کہ پطرس کے مطالعے اور مشاہدے کی وسعت کا اندازہ ہوگا بلکہ آپ طنز و ظرافت کی زیریں لہر کو بھی محسوس کرتے چلے جائیں گے جو اس مضمون کے رگ و پے میں نہ صرف سرایت کر گئی ہے بلکہ ہمہ وقت دوڑ رہی ہے۔ یہاں پطرس نے منظر نگاری کا ثبوت دیا ہے اور کمال تو ہے کہ اس پر ہر جگہ انہوں نے اصول فطرت کو مدنظر رکھا ہے۔ کتے کی یہ فطرت ہے کہ وہ حلوائی کے بجھے ہوئے چولہے کے اندر رات میں چھپ کے اور منہ پیٹ میں کر کے سوتے ہیں۔ بیدار ہوتے ہی کیں کیں کرنے لگتے ہیں۔ ایک کی آواز سن کر دوسرے اور تیسرے سارے کتے بھوکنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کتے سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھے یا سوئے رہتے ہیں اور بہ مشکل تمام اپنی جگہ سے ہٹتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ پطرس نے اپنے مضمون میں کتوں کی ان تمام خصلتوں اور عادتوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے لیکن پطرس کی جزئیات نگاری کا کمال ہے کہ انہوں نے ہر بات میں طنز و مزاح کا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ زبان دانی کے لحاظ سے خاص خاص مقامات پر بقول رشید احمد صدیقی انہیں تشابہ لگ گیا ہو لیکن فنی اعتبار سے کہیں بھی ان کی تحریر میں سپاٹ پن پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ ہر لفظ جچا تلا معلوم ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اور جو کچھ لکھا ہے بس اتنا ہی لکھنا ضروری تھا۔ کتے حلوائی کے چولہے سے باہر لپکے اور پڑھنے والوں کے سامنے کتوں کی فطرت اس واقعہ کا منظر اور موسم سب کچھ آ گیا۔ پطرس نے ایک لفظ مشاعرہ اور اس کے لوازمات غزل، مقطع اور قصیدے استعمال کیے اور مشاعرے سے تعلق رکھنے والوں کی پوری نفسیات اور ان کی خامیاں ان کے انداز اور ان کی روایات سب کچھ نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔ یہ پطرس کا کمال نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے دو سطر کے جملے میں دیسی لوگوں کے کتوں کا جو پتلون اور کوٹ دیکھ کر ہی بھونکنے لگ جاتے ہیں، ذکر کر کے نیشنلسٹوں کی نام نہاد باتوں پر گہرا طنز کیا ہے اور تان سین کا نام لے کر موسیقی پر بھی اپنا طنزیہ وار کر ڈالا ہے اور بلاشبہ وار او چھے نہیں کیے ہیں۔ کیوں کہ پطرس نے موازنہ کے حربے کو اتنی ہوشیاری سے استعمال کیا ہے ان کے مضمون میں کہیں بھی بھرتی کی کوئی چیز نہیں ملتی ہے۔ نہ تو پلاٹ کی بھول بھلیا ہے اور نہ کردار میں غیر فطری پن "کتے" اپنی تمام عادات و خصائل کے ساتھ جیتے جاگتے موجود ہیں اور موازنہ کا حربہ ان کی ایک عادت و خصلت سے مختلف نشانوں پر طنز و مزاح کے نشتر لگا رہا ہے۔ یہاں پطرس نے ایک کارٹونسٹ کی طرح بہ حیثیت طنز نگار کتے کے پلوں کو دو دو تین تولے کی حد تک چھوٹا اور کم وزن بنا کر اور پھر ایک طرف دوغزلے، سہ غزلے اور دوسری طرف دوروزہ اور سہ روزہ کہہ کر اس تقابل سے جو طنز و مزاح پیدا کرتا ہے انگریزی ادب سے ان کے اکتساب ہی نہیں بلکہ ان کی دور بینی اور کامیاب فن کاری کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔ یوں تو اپنی عام خصلت کے مطابق پطرس کے کتے بھی سڑک کے بیچ لیٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی اس حالت اور خصلت کے پردے میں مزاحیہ منظر نگاری سے کام لیتے ہوئے انہوں نے عمل سے بیگانہ بلکہ حرکت و عمل کی دنیا میں اور رکاوٹ پیدا کرنے والے فلسفیوں اور نام نہاد دوسرے کو ٹھگنے والے سادھوؤں پر جس طرح گہرا طنز کیا ہے وہ تحریف معنوی سے طنز و مزاح پیدا کرنے میں ان کی کامیابی کا زندہ نمونہ ہے۔ واقعی کتے اور کتوں کے پلے تو ہمیں آئے دن بلکہ رات

ودن دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن پطرس جیسے فنکار کی تحریر روز روز پڑھنے کو نہیں ملتیں۔ پطرس کے منفرد اور اچھوتے اسلوب نے اس موضوع اور اس فن میں جان ڈال دی ہے۔ یہ پطرس کی دور اندیشی نہیں تو اور کیا ہے انہوں نے اس جزئیات کو دیکھا ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی دکھایا ہے جن پر عام لوگوں کی یا تو نظر ہی نہیں پڑتی ہے یا نظر پڑ بھی جاتی ہے تو اس انداز سے نہیں پڑتی کہ وہ ان کے پردے میں زندگی اور نظام زندگی، ادب، تہذیب اور نظریات کے بے تکے پن کو دیکھ سکیں۔ پطرس نے اس مضمون میں مشاعروں کے بے تکے پن، شاعروں کی نفسیاتی خامیوں اور نیشنلسٹوں، سادھوؤں اور دوسرے طبقوں کی خرابیوں پر بہت لطیف مگر باتوں ہی باتوں اور ہنسی ہنسی میں گہرا طنز کر ڈالا ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ نہ تو طنز و مزاح کے اصولوں کو نظر انداز کیا ہے اور نہ ہی انشائیہ نگاری کی شگفتگی کو مجروح ہونے دیا اور طنز میں زہر نا کی آنے دی ہے ایسا بھی نہیں ہے کہ اختصار نے تشنگی کی شکل اختیار کر لی ہو یا وضاحت بے جا طوالت کا رنگ اختیار کر کے موضوع سے باہر بھٹکنے لگی ہو، بلکہ دراصل ہر لحاظ سے پطرس نے کتے کو بنا دیا ہے اور اس موضوع میں اپنے فن کی قوت سے ایک جان سی ڈال دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردۂ سیمیں پر کتے کو مختلف انداز سے حلوائی کے چولہے سے باہر لپکتے ہوئے پتلی سی دم کو تا حد امکان سڑک پر پھیلا کر سوئے ہوئے سڑک کے بیچ لیٹے ہوئے، بار بار ہٹانے اور بھگانے کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر محض ایک گز کے فاصلے پر جا کر لیٹے ہوئے۔ ذرا کوئی اس دُم پر چڑھ جائے تو غرا کر غصہ سے آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے۔ دیہات میں کتوں کے ڈر سے لوگوں کو رات کے وقت لاٹھی یا چھڑی ہاتھ میں رکھ کر چلتے ہوئے اور شہر میں سائیکل سواروں کو کتے کو ہٹانے کے لئے گھنٹی بجاتے ہوئے اور کار ڈرائیوروں کو اچانک بریک لیتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور کتوں کے سر میں سر ملا کر رات گئے بھوکتے ہوئے سن رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں اعلیٰ نسل کے پالتو انگریزی کتے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان سب کے فطری موازنہ سے انشائیہ نگار مختلف طبقوں پر طنز کرتا چلا جاتا ہے اس مضمون کا آخر حصہ بڑا ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہے پطرس نے ایک انگریزی کہاوت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ پتہ نہیں ''ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔'' اس جملے نے بحیثیت طنز نگار پطرس کی تحریر میں ہمدردی کا عنصر لا دیا ہے جو ایک ضروری چیز ہے۔ ظاہر ہے کتوں کی خصلت و عادت تو نہیں بدل سکتی لیکن اس بات کا امکان ہر وقت موجود ہے کہ آج زندگی میں جو بے تکا پن نظر آ رہا

Scanned with CamScanner

ہے معنوی تحریف کے ذریعہ جن لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا جا رہا اور جن کے حال پر مضمون نگار ہنس رہا ہے ان کی حالت بدل جائے۔ اسی لئے پطرس نے بنیادی طور پر ظرافت کو راہ دی ہے اور شگفتہ طرز سے کام لیا ہے جس میں زہرناکی نہیں ہمدردی ہے اور الفاظ کی بھول بھلیاں اور لطیفوں کی پیوندکاری نہیں بلکہ فصاحت اسلوب کی بداعت اور واقعات سے ظرافت پیدا کرنے کا آرٹ موجود ہے۔ اسی لئے بحیثیت مجموعی یہ کہا جائے کہ پطرس کا "کتا" اچھوتا اور کامیاب ہے جس کی اردو نثر کے طنزیہ مزاحیہ سرمایہ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

Scanned with CamScanner